www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

October 2015 • No. 467 • Rs. 20

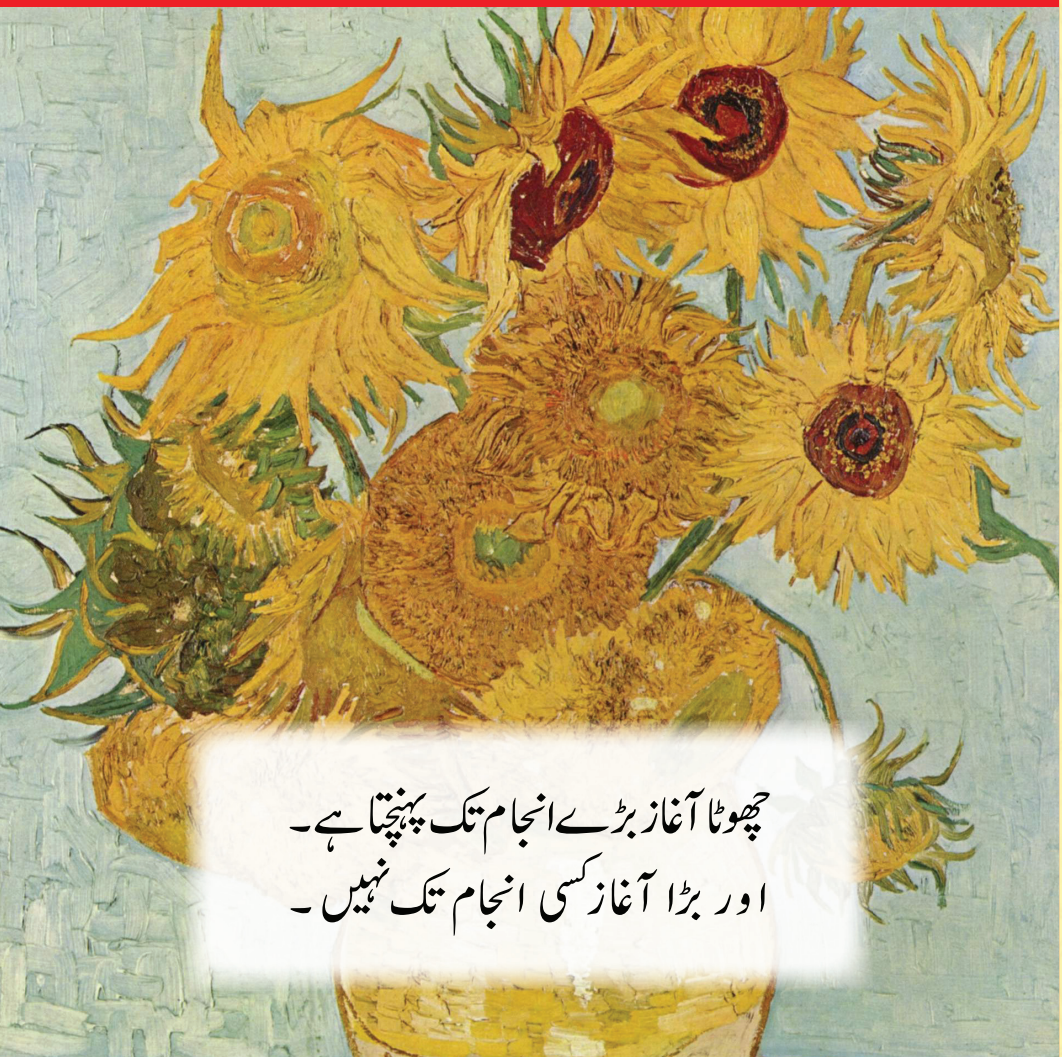

چھوٹا آغاز بڑے انجام تک پہنچتا ہے۔
اور بڑا آغاز کسی انجام تک نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083,
M. +91-8588822679, +91-8588822680
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹ 20
One year ₹ 200
Two years ₹ 400
Three years ₹ 600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051
(Total Pages: 52)

اکتوبر 2015

فہرست

عید اضحیٰ کا پیغام	4	بلا استحقاق عطیہ	30
تاریخ ساز قربانی	5	بڑا کام	31
حج بیت اللہ کے بعد	11	عدم اعتراف	32
قرآن کا ترجمہ	12	بیانیہ اسلوب، تجزیاتی اسلوب	33
اچانک موت	13	بلا شرط ساتھ دینا	34
جنت کی دنیا	14	دین اور اسٹیٹ	35
تفکیر، مفکر	15	حکمت کا اصول	36
مصائب کی حکمت	18	حروفِ مقطعات	37
مثلِ قرآن ممکن نہیں	19	شخصیت کی تعمیر	38
صحیح مگر غلط	20	جنت اور جہنم	39
کوئی چیز ملکیت نہیں	21	خبر کی تحقیق ضروری	40
ربط کے بغیر ملاقات	22	سوانح عمری	41
سیاسی ظلم نہیں	23	خالق کی کاملیت	42
تاریخ کا نیا دور	24	سادگی کی اہمیت	43
صبر کا انعام	25	سوچنے کا طریقہ	44
پاکستانی ڈائسپورا	26	امیج بلڈنگ	45
دنیا کی حقیقت	28	سوال و جواب	46
اللہ کی انگلیوں کے درمیان	29	خبر نامہ اسلامی مرکز	47

عیدالاضحیٰ کا پیغام

عیدالاضحیٰ کے موقع پر اہل ایمان جانور کی قربانی دیتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول الله ما هذه الأضاحي؟ اے خدا کے رسول، یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپ نے جواب دیا: سنة أبيكم إبراهيم۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3127) یعنی تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ۔

حضرت ابراہیم کا طریقہ کیا تھا۔ وہ صرف یہ نہیں تھا کہ انھوں نے ایک مینڈھے کو پکڑا اور اس کو ذبح کر دیا۔ مینڈھے کا ذبیحہ ایک فدیہ کا معاملہ تھا۔ حضرت ابراہیم کا زمانہ ساڑھے چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔

اللہ کے منصوبے کے تحت وہ عراق کے زرخیر علاقے سے نکلے، اور اپنی بیوی ہاجرہ، اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لا کر عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ یہ گویا ڈیزرٹ تھراپی (desert therapy) کا معاملہ تھا۔ یعنی صحرائی ماحول میں تربیت دے کر ایک نئی نسل بنانا جو پیغمبرانہ مشن کی حامل بنے۔ گویا عیدالاضحیٰ کی قربانی خود اپنی قربانی ہے۔ جانور کی قربانی صرف فدیہ (37:107) کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو عیدالاضحیٰ کا دن وہ دن ہے جب کہ ہر مسلمان کو یہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ قربانی کی سطح پر اپنے آپ کو اللہ کے مشن کے لیے وقف کرے گا۔ وہ اس پرامن دعوتی مشن کے لیے اپنے آپ کو بھرپور طور پر لگائے گا۔ وہ اپنے وقت اور اپنے مال کو اس مشن میں خرچ کرے گا۔

عیدالاضحیٰ کی قربانی دراصل اس بات کا عزم ہے کہ اہل ایمان دوبارہ ابراہیمی تاریخ کو دہرائیں گے۔ پیغمبر کے دعوتی مشن کو زندہ کرنے کے لیے دوبارہ وہ سب کچھ کریں گے جس کا کرنا حالات کے لحاظ سے ضروری ہو۔ اپنی اولاد کے لیے ان کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوگی کہ وہ پیغمبرانہ مشن میں اپنا رول ادا کریں، وہ دورِ جدید کے ''اسماعیل اور ہاجرہ'' بنیں۔

تاریخ ساز قربانی

جدید اثری تحقیقات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش 2160 ق م میں ہوئی۔ 175 سال کی عمر پاکر آپ نے 1985 ق م میں انتقال فرمایا۔ آپ دریائے فرات کے کنارے واقع قدیم شہر اُر (Ur) میں پیدا ہوئے۔ اس علاقہ کو پرانے زمانے میں بابل کہا جاتا تھا، اب اس کو عراق کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کی قوم سورج، چاند اور ستاروں کو پوجتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے تقریباً 5 ہزار خدا بنا رکھے تھے۔ ان میں سورج اور چاند سب سے بڑے تھے مگر حضرت ابراہیم کو اپنی قوم کے دین سے رغبت نہ ہوسکی۔ انسانی بستیوں کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے لئے کشش نہ پاکر آپ بستی سے باہر نکل جاتے اور تنہائیوں میں زمین و آسمان کے نظام پر غور کرتے۔ ماحول کے فکری دباؤ سے آزاد ہوکر جب آپ سوچتے تو آپ پر نئی حقیقتوں کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آتے۔ آپ آسمان میں یہ منظر دیکھتے کہ چاند چمکتا ہے اور پھر ماند پڑ جاتا ہے۔ ستارے نکلتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں۔ سورج روشن ہوتا ہے اور پھر رات کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے۔ ان واقعات پر غور کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ چیزیں جو عروج وزوال کے قانون میں بندھی ہوئی ہیں وہ خدا نہیں ہوسکتیں۔ خدا تو وہی ہوسکتا ہے جو عروج وزوال کی حد بندیوں سے اوپر ہو۔

یہ آپ کی ایثار وقربانی سے بھری ہوئی زندگی میں پہلا ''ایثار'' تھا۔ جوانی کی عمر میں آدمی تفریحات میں رہنا پسند کرتا ہے مگر آپ نے خاموش تنہائیوں کو اپنا دوست بنایا۔ اس زمانہ کو آدمی بے فکری میں گزار دیتا ہے مگر اس کو آپ نے سنجیدہ سوچ بچار کی بے قراری کے حوالے کر دیا۔ اس عمر کو پہنچ کر آدمی مادی لذتوں اور دنیوی ترقیوں کی طرف دوڑتا ہے مگر آپ نے اپنی بہترین گھڑیوں کو حقیقت کی تلاش میں لگا دیا۔ آدمی کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے آباء واجداد کے مذہب پر چل پڑے مگر آپ نے ایک انقلابی انسان کی طرح رواج کو چھوڑ کر سچائی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''جو ہو رہا ہے'' کے مقابلہ میں آپ نے ''جو ہونا چاہئے'' کو ترجیح دی۔ یہ بہت بڑا نفسیاتی ایثار

تھا۔ ماحول کے خلاف کسی سچائی کو اختیار کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اس کے سوا سب کچھ چھوڑنے پر اپنے کو راضی کرلے۔ جب آپ نے یہ فیصلہ کیا تو اللہ نے اس کو اس طرح قبول فرمایا کہ آپ پر سچائی کی معرفت کے دروازے کھول دئے اور آپ کو اپنی پیغمبری کے لئے چن لیا۔ یہ خدائی کام آپ کے سپرد ہوا کہ آپ اپنے وقت کے انسانوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کردیں۔

اس کے بعد آپ کے ایثار کا دوسرا شدید ترین دور شروع ہوتا ہے۔ آپ کے زمانہ کا حکمراں نمرود (ارنمو) خدائی بادشاہ بن کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح نمرود نے عوام میں یہ عقیدہ بٹھا رکھا تھا کہ اس کو حکومت کرنے کا خدائی حق حاصل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ سورج سب سے بڑا معبود ہے اور نمرود کا خاندان اس معبود کا دنیوی مظہر ہے۔ سورج جس طرح ''آسمانوں پر'' حکومت کررہا ہے اسی طرح سورج کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کو یہ حق ہے کہ وہ زمین پر بسنے والوں کا حاکم بنے۔

اس اعتبار سے سورج چاند کی پرستش، اس زمانہ میں محض ایک مذہبی عقیدہ نہ تھی بلکہ وہ اس وقت کی سیاست کی اعتقادی بنیاد بھی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد عوامی حاکمیت ہے، اُس زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد خدائی حق حکمرانی تھا اور یہ خدائی حق حکمرانی اس شاہی خاندان کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا جو مفروضہ معبود کی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ حضرت ابراہیم کا گھرانا اس نظام میں خاص اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ آپ کا باپ آذر (Terah) اس زمانہ کے بت سازی کے ''کارخانہ'' کا مالک تھا اور شاہی بت خانہ میں افسر اعلی کا درجہ رکھتا تھا۔ وقت کے سیاسی نظام میں اس کو بہت اونچی سیاسی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا عہدہ اس زمانہ کے لحاظ سے تقریباً وہی تھا جو آج کل کسی ایسی سیاسی پارٹی کے صدر کا ہوتا ہے جو کسی ملک میں حکمراں پارٹی کی حیثیت رکھتی ہو۔

ان حالات میں حضرت ابراہیم کے لئے بنا بنایا کامیابی کا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی جگہ لیں، وہ قائم شدہ نظام کا ساتھ دے کر اس میں اونچا مقام حاصل کرلیں۔ مگر آپ نے دوبارہ ایثار وقربانی کے راستہ پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے باپ آزر سے صاف لفظوں میں کہا: کیا تم

ستاروں کو خدا مانتے ہو اور ان کی شکلیں بنا کر ان کو پوجتے ہو۔ یہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں مَیں تم کو اور تمھاری قوم کو دیکھ رہا ہوں (6:74)۔

حضرت ابراہیم نے اپنے وقت کے ستارہ پرستی کے نظام سے اپنے باپ کی طرح موافقت نہیں کی بلکہ وہ اس کے خلاف داعی اور مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ جس نظام میں اعلیٰ ترین عہدہ ان کا انتظار کر رہا تھا وہ خود اس نظام کو بدلنے کے علم بردار بن گئے۔ انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ناحق کو مان کر اس کے ڈھانچے میں عزت اور ترقی کے خواب دیکھیں بلکہ ناحق کی تردید اور حق کا اعلان کرنے کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھر سے نکال دئے گئے۔ قوم میں حقیر سمجھے جانے لگے۔ خود بادشاہ وقت بھی آپ کا دشمن بن گیا۔ کیوں کہ آپ کی تحریک، اس وقت کے حالات میں بادشاہ کو اس کی سیاسی زمین سے محروم کرنے کے ہم معنی تھی۔

چلتے ہوئے نظام سے بغاوت ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ اس نظام کے اندر آدمی ہر قسم کے مواقع سے محروم ہو جائے۔ چناں چہ حضرت ابراہیم کے اس فیصلہ نے آپ کی پوری زندگی کو ایثار و قربانی کی زندگی بنا دیا۔ آپ گھر سے بے گھر کئے گئے۔ خاندانی جائداد میں آپ کا کوئی حصہ نہ رہا۔ باپ کی جانشینی کے لئے آپ نااہل قرار پائے۔ وقت کے سماج میں آپ کی حیثیت ایک اجنبی انسان کی ہو گئی۔ اُر کی تقریباً تین لاکھ کی آبادی میں کوئی آپ کا ساتھی نہ رہا۔ وقت کی حکومت آپ کو خطرہ کی نظر سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ آپ اس کے پھیلائے ہوئے اِس توہماتی عقیدہ کی تردید کرتے تھے کہ سورج چاند خدائی ہستیاں ہیں اور اُن کی طرف سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ زمین پر لوگوں کا بادشاہ بن جائے۔

حضرت ابراہیم نے پرسکون زندگی کے اوپر مصیبت کی زندگی کو ترجیح دی۔ انھوں نے عوام کے درمیان مقبولیت کے مقابلہ میں عوام کے درمیان اجنبی بن جانے کو پسند کر لیا۔ وہ عہدہ اور جائداد کو چھوڑ کر خالی ہاتھ ہو جانے پر قانع ہو گئے۔ بادشاہ وقت کے دربار میں معزز کرسی پر بیٹھنے کے بجائے انھوں نے یہ خطرہ مول لیا کہ بادشاہ کی نظر میں وہ معتوب ہو جائیں اور حکومت کی طرف سے ان کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ قوم کے اندر بے عزت کئے گئے۔ پھر آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا جس سے اللہ

نے آپ کو بچالیا۔اس کے بعد آپ کو مجبور کیا گیا کہ آپ عراق کو چھوڑ دیں اور ملک کے باہر چلے جائیں۔

یہاں سے آپ کی زندگی میں ایثار وقربانی کا ایک اور شدید تر مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ملک کے معزز ترین خاندان کا ایک فرد اس طرح بے سروسامانی کی حالت میں اپنے وطن سے نکلا کہ اس کے ساتھ صرف اس کی بیوی سارہ تھی اور اس کا بھتیجا لوط۔تین آدمیوں کا یہ مختصر قافلہ خانہ بدوشوں کی طرح دریائے فرات کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا حاران پہنچا۔پھر بحر ابیض کے ساحلی علاقوں سے گزرتا ہوا شام اور فلسطین اور مصر تک چلا گیا۔مگر ان مقامات کے لوگ بھی اسی قسم کے غیر خدائی معبودوں کو ماننے والے تھے جن کو نہ ماننے کے جرم میں آپ کو اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔آخر اللہ کی طرف سے آپ کو یہ حکم ہوا کہ تم حجاز کے بے آب وگیاہ علاقہ میں جاؤ۔وہاں پتھروں اور خشک پہاڑوں کے درمیان خدا کا ایک گھر بناؤ۔بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم جب مکہ آئے تو اس وقت وہاں نہ کوئی آدمی تھا اور نہ پانی (ليس يومئذ بمكة احد وليس بها ماء۔صحيح البخاري، حدیث نمبر:3364) وقت کے انسانوں نے خدا کو چھوڑ کر خود اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کردی تھی۔تاہم پتھر اور پہاڑ اب بھی اپنی اصل فطری حالت پر باقی تھے۔اس فطرت کے ماحول میں آپ کو خدا کا گھر بنانے کا حکم ہوا تاکہ کوئی بندہ جو خالص خدا کی عبادت کرنا چاہے وہ یہاں آکر خدا کی عبادت کرے۔اب حضرت ابراہیم بحر قلزم کے ساحلی علاقوں سے گزرتے ہوئے موجودہ مکہ کے مقام پر پہنچے اور یہاں بیت اللہ کی تعمیر کی۔وہ شخص جو عزت اور خوش حالی کی گود میں پیدا ہوا تھا اُس نے حق کی خاطر تنہائی، مسافرت اور تنگ ودشوار زندگی کو اپنے لئے اختیار کرلیا۔

حضرت ابراہیم 75 سال کی عمر میں عراق سے نکلے تھے۔10 سال کی مسافرانہ زندگی کے بعد 2074 ق م میں آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے اسماعیل رکھا (اسماعیل کے معنی سمیع اللہ کے ہیں) اس وقت آپ کی عمر 86 سال تھی۔بڑھاپے کی اولادیوں بھی آدمی کو عزیز ہوتی ہے۔اور آپ کا حال تو یہ تھا کہ تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اب آپ تمام تر اپنے بیوی بچے کے سہارے پر رہ گئے تھے۔ایسی حالت میں ہونہار لڑکا آپ کو کتنا زیادہ

محبوب ہوگا۔ مگر بیٹا جب بڑا ہوا اور آپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو ایثار وقربانی کا ایک اور کڑا امتحان سامنے آگیا۔ خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنے آخری سہارے سے بھی دست بردار ہوجاؤ، اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کردو۔ تورات کے بیان کے مطابق جب قربانی کا حکم ہوا تو اس وقت آپ کے فرزند کی عمر 13 سال تھی۔

حضرت ابراہیم سو سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کررہا ہوں۔ خواب کو عام طور پر ایک تمثیلی چیز سمجھا جاتا ہے۔ آپ اس کو کسی تعبیری مفہوم میں لے سکتے تھے۔ مگر یہ حضرت ابراہیم کے ایثار وقربانی کے جذبہ کی انتہا تھی کہ آپ نے خواب کی کوئی تاویل نہ کی۔ آپ اس خواب کو اس کی اصلی صورت میں زیر عمل لانے کے لئے تیار ہوگئے۔ مَروہ پہاڑی کے مقام پر تاریخ کا وہ انوکھا واقعہ پیش آیا جس کو دیکھنے کے لئے زمین وآسمان رک گئے۔ بوڑھا باپ اپنے محبوب بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کررہا تھا۔ تاہم اللہ تعالی نے عین وقت پر مداخلت کرکے حضرت اسماعیل کو ذبح ہونے سے بچالیا۔ آسمان سے آواز آئی کہ بس تم نے تسلیم ووفاداری کا آخری ثبوت دے دیا۔ بیٹے کے بدلے میں اللہ نے آپ کی طرف سے مینڈھے کی قربانی قبول کرلی۔ اس کے بعد یہ طریقہ مستقل طور پر تمام خدا پرستوں کے لئے مقرر کردیا گیا۔ حکم ہوا کہ آدمی اپنی قربانی کے علامتی فدیہ کے طور پر ہر سال انھیں تاریخوں میں جانور ذبح کرے جن تاریخوں میں حضرت ابراہیم خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے۔

حضرت ابراہیم کو جو خواب دکھایا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے عزیز بیٹے کو دعوت توحید کے مرکز (بیت اللہ) کی خدمت کے لئے وقف کردیں۔ اسی غرض سے حکم ہوا تھا کہ اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے جاکر مکہ کی خشک اور سنسان زمین پر بسادو۔ مگر اس بات کو چھری سے ذبح کرنے کی صورت میں ممثّل کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دین کی خدمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، یہ اپنے آپ کو جیتے جی ذبح کرنا ہے۔ ''ذبح'' ایثار وقربانی کی آخری انتہا ہے اور ایثار وقربانی کی آخری انتہا پر پہنچ کر ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کی خدمت کرسکے۔

حضرت ابراہیم کا ایثار صرف یہ نہ تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ بیٹے کی قربانی تو ایثار و قربانی کے لمبے سلسلے کی صرف آخری صورت تھی۔ آپ کا ایثار یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ لوگ صرف دکھائی دینے والے خداؤں کے لیے اپنی محبتیں اور عقیدتیں وقف کر رہے تھے، آپ نے نہ دکھائی دینے والے خدا کو اپنی محبت و عقیدت کا مرکز بنایا۔ ایسے حالات میں جب کہ ناحق ہر طرح کے مادی دلائل کے زور پر اپنی اہمیت ثابت کر رہا تھا، آپ نے ایک ایسے حق کو پہچانا اور اس کو قبول کر لیا جس کی تائید میں صرف ذہنی دلائل قائم ہو سکے تھے۔ ایسی فضا میں جب کہ باطل کے ساتھ مصالحت کرنے میں آپ کے لئے عزت و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، آپ نے محض سچائی کی خاطر ایک ایسے غیر مصالحانہ راستہ کو اختیار کر لیا جس میں سختیوں اور مشکلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسے ماحول میں جب کہ لوگ متمدن شہروں میں اقامت کو پسند کر رہے تھے، آپ نے ایک خشک بیابان میں لے جا کر اپنے گھر والوں کو بسا دیا۔

یہ سب کچھ غیر معمولی ایثار و قربانی کے جذبہ کے تحت ہوا۔ ایثار و قربانی کی نفسیات کے بغیر ان میں سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا تھا — خدا پرست بننا اپنے کو ذبح کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے کو ذبح کرنے پر تیار نہ ہو وہ خدا پرست بھی نہیں بن سکتا۔

بنگلور میں الرسالہ (اردو، انگلش)، دعوتی لٹریچر اور گڈ ورڈ بکس کی تمام مطبوعات کے لئے رابطہ کریں:

Mahboob Book Depot
Opp. Russel Market, Shivajinagar, Banglore-5560 051
Ph. 22867138, 09538293903, E-mail: faizan500@gmail.com

ناگپور اور کامٹی میں الرسالہ مشن کے افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر مہینہ کے پہلے اتوار کو ہوتی ہے۔ رابطہ کے لئے:

Mukhtar Ansari-09371745384
Khalilur Rehaman-9370050442
Irfan Rasheedi-9604367878

حج بیت اللہ کے بعد

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں حج کا حکم آیا ہے، اس سلسلۂ کلام کی ایک آیت یہ ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرۃ: 200)۔ پھر جب تم اپنے حج کے مناسک پورے کرلو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

حج کے مناسک کی ادائیگی کے بعد زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کلماتِ ذکر کا بکثرت ورد کیا جائے۔ بلکہ اس سے مراد دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی حج کی ابراہیمی سنت کی ادائیگی کے ذریعے جو اسپرٹ تم نے اپنے اندر پیدا کی ہے اس کو لے کر دنیا میں پھیل جاؤ اور اللہ کے پیغام کو دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچا دو۔ اور ہر سال حج کے بعد یہی دعوتی کام کرتے رہو۔

حج کے بعد کے عمل سے مراد دعوت یعنی تمام انسانوں کو خدا کے کریشن پلان سے آگاہ کرنا ہے۔ اس تفسیر کا ماخذ خود سنت رسول ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ حجۃ الوداع کا فریضہ ادا کیا۔ پھر حج سے واپسی کے بعد آپ مدینہ آئے وہاں آپ نے ایک مفصل خطاب میں اپنے اصحاب کو یہ پیغام دیا: إن الله بعثني رحمة وكافة (للناس)، فأدوا عني يرحمكم الله، ولاتختلفوا علي كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم (سیرت ابن ہشام: 2/607)۔ بیشک اللہ نے مجھے بھیجا ہے رحمت بنا کر اور تمام انسانوں کے لیے، تو تم میری طرف سے لوگوں کو پہنچا دو، اللہ تمھارے اوپر رحم فرمائے، اور تم میرے ساتھ اختلاف نہ کرو جیسا عیسی بن مریم کے حواریوں نے کیا۔

امت مسلمہ کا مشن دعوت الی اللہ ہے۔ حج کا مقصد یہ ہے کہ امت کے افراد ہر سال مکہ کے تاریخی مقام پر مجتمع ہوں، یہاں وہ مختلف اعمال کے علامتی اعادہ کے ذریعے پیغمبر کی دعوتی سنت کو یاد کریں۔ اور پھر دعوت الی اللہ کی اسپرٹ کو لے کر دنیا میں پھیل جائیں، جیسا کہ اصحابِ رسول اس دعوتی مقصد کے لیے دنیا میں پھیلے تھے۔

قرآن کا ترجمہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن اس لئے بھیجا گیا کہ وہ سارے عالم کے لئے نذیر (warner) بنے۔ ساری قوموں کے لئے نذیر بننا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ قرآن کو ان کی اپنی قابل فہم زبان میں ترجمہ کرکے ان کو پہنچایا جائے۔ یہ اصول خود قرآن سے ان الفاظ میں معلوم ہوتا ہے— پیغمبر کو قوم کی اپنی زبان میں بھیجنا۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (14:4)۔

یہ اللہ کی ایک سنت ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ پچھلے زمانے میں خدا قوموں کو خود ان کی اپنی زبان میں ہدایت بھیجے، اور بعد کے زمانے میں ساری قوموں کو صرف عربی زبان میں ہدایت بھیجے۔ یہ غیر فطری بھی ہے اور اللہ کی سنت کے خلاف بھی۔ اس لیے اب امت کا فرض ہے کہ وہ قرآن کو تمام قوموں کی زبانوں میں ترجمہ کرکے ان قوموں تک پہنچائے۔ اس کے بغیر قوموں پر اللہ کی حجت تمام نہیں ہوسکتی۔ پرنٹنگ پریس کے دور میں ایسا کرنا پوری طرح ممکن ہوگیا ہے۔ موجودہ زمانے میں پرنٹنگ پریس اور کمیونی کیشن کا سب سے بڑا استعمال یہی ہے۔

مسلمانوں نے عربی زبان میں تو قرآن کے بے شمار نسخے چھاپ کر ہر جگہ پھیلا دیے ہیں۔ لیکن یہ کام کرنا ابھی تک باقی ہے کہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں قرآن کا قابل فہم ترجمہ تیار کیا جائے، اور اس کو ہر انسان تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہاں تک کہ کوئی انسان اس سے بے خبر نہ رہے۔ موجودہ زمانے میں یہ کام پوری طرح ممکن ہو چکا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ کے اندر اس کی اہمیت کا شعور پیدا ہو جائے۔ امت مسلمہ کا اصل فریضہ شہادت علی الناس یا دعوت الی اللہ ہے۔ اس کام کی ادائیگی امت مسلمہ پر اسی طرح فرض ہے جس طرح اس پر نماز اور روزہ فرض ہے۔ یہ فریضہ، فرض عین کی مانند ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلم فرد کو اس کام کی ادائیگی میں اپنا حصہ لازماً ادا کرنا ہے۔

اچانک موت

انڈیا کے سابق پریسڈنٹ ڈاکٹر عبدالکلام 27 جولائی 2015 کو انتقال کر گیے۔ بوقت وفات ان کی عمر 83 سال تھی۔ وہ نئی دہلی سے شیلانگ گیے۔ وہاں ان کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف منیجمنٹ (Indian Institute of Management) شیلانگ میں ایک سائنسی موضوع پر لکچر دینا تھا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے اپنا لکچر شروع کیا۔ اس وقت ہال میں سامعین اور میڈیا کے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

ڈاکٹر کلام بمشکل پانچ منٹ بول پائے تھے۔ اس کے بعد اچانک ان کی زبان بند ہوگئی، اور وہ اسٹیج پر گر پڑے۔ ان کو فوراً اسپتال لے جایا گیا، لیکن وہاں ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ ڈاکٹر کلام کی موت واقع ہوچکی ہے۔ لکچر کا آخری جملہ جو ان کی زبان سے نکلا، وہ یہ تھا:

It is the destiny of our nation that an Indian brain requires an acknowledgment from a foreign...

موت لازماً ہر انسان پر آتی ہے۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ موت کسی آدمی پر اس طرح آتی ہے کہ وہ بیمار ہوجائے، یا اس کو کوئی حادثہ پیش آجائے، یا وہ بوڑھا ہوکر مرے۔ لیکن خالق کبھی ایسا کرتا ہے کہ انسان کی موت اچانک آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نہ کوئی آخری وصیت کرسکتا، اور نہ وہ اپنا درد دوسروں سے بیان کرسکتا۔ وہ بالکل نارمل حالت میں ہوتا ہے کہ اچانک اس کی آواز بند ہوجاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔

کسی شخص پر اچانک موت اس لیے آتی ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر سبق لیں، وہ بے خبری کی زندگی نہ گزاریں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک صحابی رسول عبداللہ ابن عمر نے ان الفاظ میں بیان کیا: إذا أمسيت فلا تنتظر الصباح، وإذا أصبحت فلا تنتظر المساء (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6416) جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب تم صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔

جنت کی دنیا

قرآن کی سورہ نمبر 35 میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت جب جنت کی زندگی کا تجربہ کریں گے تو اس کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (35:34) یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہوگی جو درد اور غم سے مکمل طور پر خالی ہوگی۔

اہل جنت کا یہ کلمہ، ایک بہت معنی خیز کلمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی دنیا ہے، جو انسان جیسی مخلوق کے لئے خوشیوں کی دنیا بن سکتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو حزن (pain) سے خالی ہو۔ انسان بے حد حساس مخلوق ہے۔ حزن کا معمولی سا تجربہ بھی انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔ انسان کو رہنے کے لئے ایک ایسا محل مل جائے جس میں بظاہر آرام کے تمام سامان موجود ہوں لیکن اسی کے ساتھ اس میں رہنے والے انسان کو کوئی حزن لاحق ہو۔ مثلاً، اس کے ایک دانت میں درد پیدا ہو جائے تو انسان اتنا بے چین ہو جائے گا کہ محل میں موجود آرام و راحت کے تمام سامان اس کے لئے بے معنیٰ ہو جائیں گے۔ انسان جیسی مخلوق کے لئے صرف وہ دنیا خوشی کی دنیا بن سکتی ہے، جو حزن سے مکمل طور پر پاک ہو۔

انسان کی نسبت سے یہ بیان ایک بے حد مبنی بر واقعہ بیان (factual statement) ہے۔ قرآن کا یہ بیان کامل معنوں میں ایک مبنی بر واقعہ بیان ہے۔ اتنا زیادہ مبنی بر واقعہ بیان کسی انسان کے لئے ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بیان اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی کتاب ہے جو تمام حقائق سے کامل واقفیت رکھتا ہے۔

مزید یہ کہ ایک ایسی دنیا بنانا جو کامل معنوں میں انسان کے تخلیقی ساخت سے مطابقت رکھتی ہو، ایک ایسا کام ہے جو صرف رب العالمین کے لئے ممکن ہے۔ یعنی ایک ایسا رب جو پورے معنوں میں عالمی اختیارات کا مالک ہو۔ اس طرح یہ آیت خدا کے وجود کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہے، اور اس بات کا ثبوت بھی کہ قرآن، رب العالمین کا کلام ہے، وہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

تفکیر، مفکر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن 610 عیسوی میں شروع کیا۔ اس سے پہلے لمبی مدت تک آپ کا حال یہ تھا کہ آپ متلاشی (seeker) بنے ہوئے تھے۔ نبوت ملنے سے پہلے آخری زمانے میں آپ کا معمول یہ تھا کہ آپ مکہ کے قریب ایک پہاڑ کے غار (cave) میں چلے جاتے تھے، جس کا نام غارِ حرا تھا۔ اس غار میں آپ مراقبہ (meditation) نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ وہاں مسلسل طور پر غور وفکر (contemplation) میں مشغول رہتے تھے۔ غارِ حرا کے اسی قیام کے آخری دن آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ غارِ حرا پیغمبرِ اسلام کی ایک سنت ہے۔ یہ سنت بتاتی ہے کہ سچے انسان کی زندگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ قرآن میں اس معاملے کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى (93:7) یعنی اللہ نے تم کو تلاشِ حق میں سرگرداں پایا تو تم کو اس نے رہنمائی دی۔ یہ واقعہ پیغمبرِ اسلام کی اُسی طرح ایک سنت ہے جس طرح آپ کی دوسری سنتیں۔

حقیقی مفکر وہ ہے جو حراء جیسے مرحلے سے گزر کر مفکر بنے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ تقریباً تمام وہ لوگ جو مفکر (thinker) سمجھے جاتے ہیں، وہ اس تفکیری مرحلہ (thinking process) سے گزر کر مفکر نہیں بنے، بلکہ وہ اپنے قریبی حالات کے زیر اثر مفکر بنے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ معاملہ مذہبی مفکرین کا بھی ہے اور سیکولر مفکرین کا بھی۔

سیکولر مفکرین کی ایک نمایاں مثال کمیونسٹ مفکر کارل مارکس (وفات: 1883) کی ہے۔ اس کا فکر اپنے زمانے کے صنعتی مسائل کے تحت بنا۔ یہ فکر ٹکراؤ کے اصول پر مبنی تھا۔ جس کو خود اس نے جدلیاتی فکر (dialectical interpretation of history) کا نام دیا ہے۔ یہی معاملہ ان افراد کا بھی ہے جو مذہب کے دائرے میں مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی تقریباً سب کے سب ردعمل کی پیداوار تھے۔

اسلام کی لٹریری تاریخ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ عباسی دور میں ترجموں کے ذریعے یونانی علوم کا چرچا ہوا۔ اس وقت کچھ مسلم اسکالر اس کے ردّ کے لیے کھڑے ہو گیے۔ ان کو مفکر کا درجہ دے دیا گیا۔ پھر تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے حملہ کا حادثہ پیش آیا تو بہت سے مسلم اسکالر اس کے ردعمل میں لکھنے اور بولنے لگے۔ وہ بھی مسلمانوں کے درمیان مفکر قرار پائے۔ اسی طرح کچھ مسلم اسکالر نے فرقِ باطلہ کے خلاف تردیدی محاذ کھول دیا تو مسلمانوں نے ان کو بھی مفکر کا درجہ دے دیا، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں یہی معاملہ مزید اضافے کے ساتھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانے میں کچھ مسلم رہنما صہیونیت کے خلاف سرگرمی دکھا رہے ہیں، اور کچھ لوگ استشراق کے خلاف۔ کچھ مسلمان نوآبادیات کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، اور کچھ مغربی تہذیب کے خلاف۔ کچھ لوگ سیکولر حکومتوں کو زیر کرنے میں مشغول ہیں، اور کچھ لوگ مفروضہ ظالموں کے خلاف سرگرم ہیں، وغیرہ۔ یہ تمام لوگ مسلمانوں کے درمیان مفکر کا درجہ پائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ تفکیر ہے اور نہ ایسا کرنے والوں کو مفکر کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: الحمدللہ رب العالمین۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تفکیر کو مبنی بر حمد تفکیر ہونا چاہیے۔ اسلام کی تفکیر وہ ہے جو رب العالمین کی تلاش سے شروع ہو، پھر وہ معرفت تک پہنچے۔ یہ تفکیر اپنے آغاز سے لے کر اپنے انجام تک مکمل طور پر ایک مثبت تفکیر (positive thinking) ہے۔ وہ منفی سوچ (negative thinking) سے مکمل طور پر پاک تفکیر ہے۔ جو لوگ اس تفکیری شرط پر پورا اتریں، وہی حقیقی معنوں میں وہ لوگ ہیں جن کو مفکر کا درجہ دیا جائے۔

اس کے برعکس، دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی تفکیر مبنی بر عداوت تفکیر ہو۔ عداوت شیطان کا کلچر ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف عداوت کے جذبات (5:91) پیدا کرے۔ جو لوگ شیطان کی تزئین سے متاثر ہوں، وہ مختلف عذر (excuse) کو لے کر دوسرے انسانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ اسی طرز پر سوچنے لگتے ہیں،

ان کی تمام سوچ مبنی بر شکایت یا مبنی بر عداوت سوچ بن جاتی ہے۔ لوگ غلط فہمی کی بنا پر ایسے لوگوں کو مفکر کا مقام دے دیتے ہیں، حالاں کہ یہ لوگ کسی بھی درجے میں مفکر کہے جانے کے مستحق نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حراء میں جانا کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسانی حالات سے الگ ہوکر فطرت کی دنیا میں تدبر کرنا۔ انسان کے بجائے خدائی آیات (signs) میں غور کرنا۔ وقتی حالات سے اوپر اٹھ کر ابدی حقیقتوں میں غور کرنا۔ یہی سوچ درست سوچ ہے۔ جو لوگ اس طرح تدبر اور تفکر کریں، اور اس کے نتیجے میں اعلیٰ حقیقتوں کو دریافت کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں مفکر کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اس کے برعکس، وہ لوگ جن کی سوچ انسانی حالات میں پھنسی ہوئی ہو، جو انسان کے پیدا کردہ مسائل میں سوچتے ہوں، جن کا ذہن سیاسی حالات اور اخباری رپورٹوں میں الجھا ہوا ہو۔، ایسے لوگوں کی سوچ وہ سوچ نہیں جس کو قرآن میں تدبر کہا گیا ہے۔

ایسے لوگوں کی تفکیر ہمیشہ ردعمل کی تفکیر ہوتی ہے۔ دونوں قسم کی تفکیر کی پہچان یہ ہے کہ صحیح تفکیر ہمیشہ مثبت تفکیر ہوگی، اس میں کسی کے خلاف نفرت کا شائبہ نہیں پایا جائے گا۔ اس کے برعکس، ردعمل کی تفکیر ہمیشہ منفی تفکیر (negative thinking) ہوتی ہے۔ ایسے مفکرین ہمیشہ ظلم اور سازش کا انکشاف کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان اشتعال پیدا ہو۔ اور پھر یہ اشتعال بڑھتے بڑھتے متشددانہ ٹکراؤ تک پہنچ جائے۔

سچا مفکر اپنی مثبت سوچ کی بنا پر اس قابل ہوتا ہے کہ وہ منفی حالات میں بھی مثبت بات کہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ مشن کے تیرہویں سال مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچے۔ یہ ہجرت ظلم اور تشدد کے درمیان مجبورانہ طور پر ہوئی تھی۔ مگر جب آپ 16 دن کا نہایت مشکل سفر طے کرکے مدینہ پہنچے تو آپ نے مدینہ کے لوگوں کے سامنے مکہ والوں کی کوئی شکایت نہیں کی۔ اس کے برعکس، آپ نے مدینہ کے لوگوں کو سچائی کا مثبت پیغام دیا۔ ان کو وہ عمل کرنے کے لیے کہا جو ان کو جنت میں پہنچائے۔

مصائب کی حکمت

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں زندگی کی ایک حقیقت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (البقرۃ: 57-155)۔ یعنی اور ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اوپر ان کے رب کی شاباشیاں ہیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔

دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے مختلف قسم کی مصیبتیں آتی ہیں۔ یہ مصیبتیں بلاسبب نہیں ہوتیں۔ ان کی بہت بڑی حکمت ہے۔ یہ مصیبتیں انسان کو کٹ ٹو سائز (cut to size) بناتی ہیں۔ اور کٹ ٹو سائز ہونا انسان کی اصلاح کا سب سے بڑا راز ہے۔

کٹ ٹو سائز ہونا آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے۔ وہ انسان سے بڑائی کا جذبہ چھین لیتا ہے۔ وہ انسان کے اندر تواضع (modesty) کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو ایگوئسٹ (egoist) بننے سے بچاتا ہے۔

کٹ ٹو سائز ہونا انسان کو انسانِ اصلی بناتا ہے۔ انسان کو اس کی فطری حالت پر واپس لاتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ اوصاف پیدا ہوجائیں، اس کو ایک کامیاب انسان بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کٹ ٹو سائز ہونے سے پہلے انسان ایک مصنوعی انسان ہوتا ہے۔ کٹ ٹو سائز ہونے کے بعد انسان ایک حقیقی انسان بن جاتا ہے۔ اور جو انسان حقیقی انسان بن جائے اس کے لیے فطرت کے قانون کے مطابق، خیر کے تمام دروازے اس طرح کھل جاتے ہیں کہ کوئی دروازہ اس کے اوپر بند نہیں رہتا۔

مثلِ قرآن ممکن نہیں

قرآن کی سورہ نمبر 17 میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (الاسراء:88) کہو کہ اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنالائیں تب بھی وہ اس کے جیسا نہ لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

کچھ لوگوں نے قرآن کے اس چیلنج کو لفظی معنی میں لے لیا۔ انھوں نے قرآن کا لفظی جواب دینے کی کوشش کی۔ مثلاً ایرانی ادیب عبداللہ ابن مقفع (وفات: 142ھ) نے قرآن کے جواب میں ایک عربی کتاب تیار کرنے کی کوشش کی لیکن خود ہی اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے اِس منصوبے کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح یمامہ کے مسیلمہ (وفات: 12ھ) نے قرآن کے جواب میں کچھ سورتیں لکھیں۔ مثلاً سورہ الفیل کے جواب میں اس نے یہ الفاظ وضع کیے: الفیل ما الفیل له ذنب وثیل ومشفر طویل۔ مگر یہ سب لغو باتیں تھیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ چیلنج آئڈیالوجی کے معنی میں ہے۔ یعنی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ قرآن کے مقابلے میں کوئی متوازی آئڈیالوجی (parallel ideology) وضع کرسکے۔

تاریخ میں بار بار قرآن کی مثل آئڈیالوجی تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس میں مکمل ناکامی ہوئی۔ مثلاً خالق کا بدل (alternative) وضع کرنا، قرآن کے بیان کردہ تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مقابلے میں دوسرا منصوبہ وضع کرنا، وحی (revelation) کا بدل وضع کرنا، اخروی جنت کے بجائے دنیوی جنت تعمیر کرنا، كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (3:185) کے بجائے ابدی حیات کو ممکن بنانے کی کوشش کرنا، أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28) کے بجائے غیر خدا میں اطمینان قلب حاصل کرنے کی کوشش کرنا، وغیرہ۔ انسان نے بار بار ان پہلوؤں سے قرآن کا جواب وضع کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں اس کو مکمل ناکامی ہوئی۔

صحیح مگر غلط

عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى، عَنْ أَبِيه، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: كُنَّا نَجْلِسُ عَلَى بَابِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَبْلَ صَلَاةِ الْغَدَاةِ، فَإِذَا خَرَجَ، مَشَيْنَا مَعَهُ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَجَاءَنَا أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَالَ: أَخَرَجَ إِلَيْكُمْ أَبُو عَبْدِ الرَّحْمَنِ قُلْنَا: لَا، بَعْدُ. فَجَلَسَ مَعَنَا حَتَّى خَرَجَ، فَلَمَّا خَرَجَ، قُمْنَا إِلَيْهِ جَمِيعًا، فَقَالَ لَهُ أَبُو مُوسَى: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ، إِنِّي رَأَيْتُ فِي الْمَسْجِدِ آنِفًا أَمْرًا أَنْكَرْتُهُ وَلَمْ أَرَ - وَالْحَمْدُ لِلَّهِ - إِلَّا خَيْرًا. قَالَ: فَمَا هُوَ؟ فَقَالَ: إِنْ عِشْتَ فَسَتَرَاهُ. قَالَ: رَأَيْتُ فِي الْمَسْجِدِ قَوْمًا حِلَقًا جُلُوسًا يَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ فِي كُلِّ حَلْقَةٍ رَجُلٌ، وَفِي أَيْدِيهِمْ حَصًا، فَيَقُولُ: كَبِّرُوا مِائَةً، فَيُكَبِّرُونَ مِائَةً، فَيَقُولُ: هَلِّلُوا مِائَةً، فَيُهَلِّلُونَ مِائَةً، وَيَقُولُ: سَبِّحُوا مِائَةً، فَيُسَبِّحُونَ مِائَةً، قَالَ: فَمَاذَا قُلْتَ لَهُمْ؟ قَالَ: مَا قُلْتُ لَهُمْ شَيْئًا انْتِظَارَ رَأْيِكَ أَوِ انْتِظَارَ أَمْرِكَ. قَالَ: »أَفَلَا أَمَرْتَهُمْ أَنْ يَعُدُّوا سَيِّئَاتِهِمْ، وَضَمِنْتَ لَهُمْ أَنْ لَا يَضِيعَ مِنْ حَسَنَاتِهِمْ«، ثُمَّ مَضَى وَمَضَيْنَا مَعَهُ حَتَّى أَتَى حَلْقَةً مِنْ تِلْكَ الْحِلَقِ، فَوَقَفَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ: »مَا هَذَا الَّذِي أَرَاكُمْ تَصْنَعُونَ؟« قَالُوا: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ حَصًا نَعُدُّ بِهِ التَّكْبِيرَ وَالتَّهْلِيلَ وَالتَّسْبِيحَ. قَالَ: »فَعُدُّوا سَيِّئَاتِكُمْ، فَأَنَا ضَامِنٌ أَنْ لَا يَضِيعَ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ وَيْحَكُمْ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ، مَا أَسْرَعَ هَلَكَتَكُمْ هَؤُلَاءِ صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَافِرُونَ، وَهَذِهِ ثِيَابُهُ لَمْ تَبْلَ، وَآنِيَتُهُ لَمْ تُكْسَرْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّكُمْ لَعَلَى مِلَّةٍ هِيَ أَهْدَى مِنْ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ مُفْتَتِحُو بَابِ ضَلَالَةٍ. قَالُوا: وَاللَّهِ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ، مَا أَرَدْنَا إِلَّا الْخَيْرَ. قَالَ: »وَكَمْ مِنْ مُرِيدٍ لِلْخَيْرِ لَنْ يُصِيبَهُ، إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنَا أَنَّ« قَوْمًا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ "، وَايْمُ اللَّهِ مَا أَدْرِي لَعَلَّ أَكْثَرَهُمْ مِنْكُمْ، ثُمَّ تَوَلَّى عَنْهُمْ. (*سنن الدارمی*، حدیث نمبر: 210) ترجمہ کے لیے دیکھیں تجدید دین صفحہ نمبر 46-45۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عمل بظاہر خیر ہو تب بھی وہ خیر نہیں ہے۔ کسی عمل کے خیر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فارم اور اسپرٹ دونوں اعتبار سے سنت رسول کے مطابق ہو۔

کوئی چیز ملکیت نہیں

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: يَقُولُ الْعَبْدُ: مَالِي، مَالِي، إِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلَاثٌ: مَا أَكَلَ فَأَفْنَى، أَوْ لَبِسَ فَأَبْلَى، أَوْ أَعْطَى فَاقْتَنَى، وَمَا سِوَى ذَلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ، وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2959) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال۔ حالاں کہ اُس کے مال میں اس کے لئے صرف تین چیزیں ہیں —جو اس نے کھایا اور ختم کر دیا یا جو اس نے پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا جو اس نے صدقہ کیا اور وہ اس کے لئے ذخیرۂ آخرت بن گیا۔ اس کے سوا جو ہے، وہ بہر حال چلا جانے والا ہے اور وہ اس کو لوگوں کے لئے چھوڑ دینے والا ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے، اور وہ دنیا میں زندگی گزارتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس کچھ سامان حیات ہے جو بظاہر اس کا اپنا ہے۔ وہ کوئی معاشی کام کرتا ہے جس کے ذریعے وہ کچھ مال کماتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میری کمائی ہے۔ مال یا مال کے ذریعے حاصل کی ہوئی چیزوں کے بارے میں اس کا یہ ذہن بنتا ہے کہ یہ تمام چیزیں میری اپنی ہیں، میں ان کا مالک ہوں، مجھے حق ہے کہ میں جس طرح چاہوں ان کو استعمال کروں۔ لیکن موت آدمی کے اس خیال کی مکمل تردید کر دیتی ہے۔ موت بتاتی ہے کہ آدمی کے پاس کوئی بھی چیز اس کی ذاتی چیز نہیں، اس کی کوئی بھی ملکیت اس کے پاس ہمیشہ ساتھ رہنے والی نہیں۔ موت آدمی کو اس کے مال اور اس کے تمام اسباب سے جدا کر دیتی ہے۔ موت کے بعد آدمی اچانک اکیلا ہو جاتا ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو دریافت کر لے، وہ اپنے مال کو یا اپنے اسباب کو اس طرح استعمال کرے گا جو موت کے بعد کی زندگی میں اس کے کام آنے والا ہو۔ اس حقیقت کو جانے بغیر اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جاننے کے بعد اس کی زندگی آخرت رخی زندگی بن جاتی ہے۔ یہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو ہر آدمی کو جاننا چاہیے۔

ربط کے بغیر ملاقات

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو اس کے خالق نے ضعیف (4:28) پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان پیدائشی طور پر یہ احساس لے کر پیدا ہوتا ہے کہ میں ایک عاجز مخلوق ہوں۔ اپنے عجز کی تلافی کے لئے وہ ہمیشہ ایک سہارے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس چیز کو معبود کہا جاتا ہے۔ ایک خالق کے سوا کسی اور کو معبود بنانا یہ شرک ہے۔ انسان کے لئے حقیقی سہارا صرف ایک ہے اور وہ اللہ رب العالمین ہے۔ یہ سہارا اگرچہ بظاہر غیب میں ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ انسان کے بالکل قریب (2:186) موجود ہے۔ یہ قربت اتنی زیادہ حقیقی ہے کہ حدیث کے الفاظ میں ہمیشہ وہ اس سے سرگوشی کرتا رہتا ہے۔ بظاہر اس کا معبود مادی اعتبار سے اس کے قریب نظر نہیں آتا، لیکن انسان کے لئے ہر وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی اعتبار سے اپنے رب سے مکمل ربط حاصل کر سکے۔ یہ ایک ایسا ربط (contact) ہے جو بظاہر براہ راست ملاقات کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ جس انسان کا ذہنی ارتقاء اعلیٰ صورت میں ہوا ہو، وہ ہر لمحہ اس اعلیٰ ربط (high contact) کا تجربہ کرتا ہے۔ ایسا انسان جب بھی دوسری چیزوں سے کٹ کر اپنے اندر detached thinking کی کیفیت پیدا کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے رب سے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ حتی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے سرگوشی کے انداز میں بات کر رہا ہے۔ اس حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یناجي ربه (صحیح البخاری، حدیث نمبر 405)

ربط کے بغیر اپنے رب سے ملاقات کا یہ تجربہ بلاشبہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ ہر انسان کے لئے ممکن ہے بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے۔ براہ راست ربط کے بغیر ملاقات قدیم زمانے میں ایک بعید چیز معلوم ہوتی تھی۔ مگر موجودہ زمانے میں کمیونی کیشن کی ترقی نے اس معاملے کو انسان کے لیے قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ موجودہ کمیونی کیشن گویا براہ راست ربط کے بغیر ملاقات کا ایک مظاہرہ (demonstration) ہے۔ خدا سے انسان کا یہی ربط نفسیات کی سطح پر ہوتا ہے۔

سیاسی ظلم نہیں

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جو پیغمبر آئے ان پر وقت کے ارباب اقتدار نے ظلم کیا۔ اس کو کچھ لوگوں نے سیاسی ظلم کے معنی میں لے لیا اور کہا کہ اصل یہ ہے کہ پیغمبر اپنے وقت کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرکے نیا نظام بنانا چاہتے تھے۔ یہ ارباب اقتدار کے لئے ایک سیاسی خطرہ تھا اس لئے انھوں نے پیغمبروں پر ظلم کیا۔

اس معاملہ کی یہ تفسیر بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے ساتھ جو ظلم کیا گیا وہ مشرکانہ ظلم تھا نہ کہ سیاسی ظلم۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ مثلاً قرآن میں کہا گیا ہے: وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (85:8)۔ یعنی اور ان کی ان سے دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ ایمان لائے اللہ پر جو زبردست ہے، تعریف والا ہے۔

قدیم زمانے میں ساری دنیا میں مذہبی عدم رواداری (religious intolerance) کا کلچر قائم تھا۔ اس بنا پر پیغمبر جب ایک نئے مذہب کی تبلیغ کرتا تو مروجہ مذہب کے ذمے دار پیغمبر کے خلاف تشدد کرنے لگتے۔ یہ تشدد تمام تر مذہبی تشدد تھا، اس کا کوئی تعلق سیاست اور حکومت سے نہ تھا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کے علاوہ دوسرے تمام پیغمبروں نے صرف پرامن دعوت کا کام کیا ہے۔ کسی نے زمین پر حکومت قائم نہیں کی۔ حالاں کہ اگر پیغمبروں کا مشن سیاسی ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ کی مدد سے ان کو زمین پر سیاسی غلبہ حاصل ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ قرآن میں پیغمبروں کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (58:21) یعنی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ قرآن کی یہ آیت تمام پیغمبروں کے بارے میں ہے، وہ کسی ایک پیغمبر کے بارے میں نہیں۔ ایسی حالت میں تمام پیغمبروں کو اپنے زمانے میں سیاسی غلبہ حاصل ہونا چاہیے تھا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کی اس آیت میں غلبہ سے مراد نظریاتی غلبہ ہے، نہ کہ سیاسی غلبہ۔ اور اس معنی میں ہر پیغمبر کو غلبہ حاصل ہوا۔

تاریخ کا نیا دور

اسلام ساتویں صدی عیسوی میں آیا۔ اہل اسلام کی جدو جہد کے نتیجے میں اب دنیا میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ روایات میں اس انقلاب کی پیشین گوئی موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ھجرۃ بعد الفتح (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2783)۔ اس حدیث میں ہجرت اور فتح کے الفاظ صرف وقتی معنی میں نہیں ہیں، بلکہ وہ دور (age) کے معنی میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد دنیا میں ایک نیا دور آئے گا، اب ساتویں صدی کے ماڈل پر کام نہیں ہوگا۔ یعنی اب ہجرت اور جہاد کا ماڈل عملاً غیر متعلق ہوگیا ہے۔ اب وہ حالات بدل چکے ہیں جس میں ہجرت اور قتال پیش آیا تھا۔ اب صرف زمانے کی رعایت کے مطابق دعوت الی اللہ کا پرامن کام کرنا ہوگا۔ بقیہ نتائج اپنے آپ حاصل ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ کسریٰ ہلاک ہوگیا اب کوئی کسریٰ نہیں، اور قیصر ہلاک ہوگیا اب کوئی قیصر نہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3120)۔ اس میں بھی کسریٰ اور قیصر کے الفاظ علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہنشاہیت کا دور (age of imperialism) ختم ہوگیا۔ اب دنیا میں دوبارہ شہنشاہیت کا دور آنے والا نہیں۔

اس حدیثِ رسول میں پیشین گوئی کی زبان میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے بعد دنیا سے بادشاہت اور شہنشاہیت کا دور ختم ہوجائے گا۔ قدیم زمانے میں بادشاہی نظام اور شہنشاہی نظام کی بنا پر دینی تحریک کو حکومتی نظام کی طرف سے ایذا رسانی (persecution) کا معاملہ پیش آتا تھا۔ اب دینی تحریک کے لیے ایسا معاملہ پیش آنے والا نہیں۔ اب دینی تحریک کی منصوبہ بندی خالص غیر سیاسی بنیاد پر ہوگی۔ اب دینی تحریک کو شروع سے آخر تک امن کے حالات میں کام کرنے کا موقع ملے گا نہ کہ تشدد کے حالات میں، اب قیامت تک کسی تحریک کے لیے تشدد کے حالات پیش آنے والے نہیں۔

صبر کا انعام

اگر آدمی ایک چیز کے کھونے پر صبر کرلے تو اس کے بعد وہ اس سے زیادہ بڑی چیز پالیتا ہے جس کے کھونے پر اس نے صبر کیا تھا— یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ آدمی جب صبر کرتا ہے تو اس کا صبر ایک ایسی چیز پر ہوتا ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق پیش آئی تھی، جس میں آدمی کو کوئی اختیار نہیں۔ اس طرح صبر کا مطلب یہ ہے کہ نہ ملنے والی چیز پر محرومی کو بطور واقعہ تسلیم کرنا، اور ملنے والی چیز کے حصول کے لیے اپنی کوشش کو جاری رکھنا۔

صبر (patience) کوئی بے عملی کا واقعہ نہیں۔ بلکہ صبر ایک عظیم عمل ہے۔ صبر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ اس پر افسوس کرکے اپنا وقت ضائع نہ کرے، بلکہ وہ اس کو بھلا دے۔ یہی صابرانہ روش ہے۔ اس صابرانہ روش کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی بقیہ وقت کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے کہ نئے عزم کے ساتھ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ وہ نئے مواقع (opportunities) کو دریافت کرکے ان کو استعمال کرے۔ کھونے کے بعد بھی اس کے پاس جو کچھ بچا ہے اس کو منظم انداز میں کام میں لانے کی کوشش کرے۔ وہ گزرے ہوئے ناخوشگوار واقعے کو اپنے لیے ایک تجربہ بنالے۔ وہ اس سے سبق سیکھے اور آئندہ زیادہ بہتر انداز میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔

پرانا مقولہ ہے کہ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد (صبر کڑوا ہے، لیکن اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے)۔ دنیا کا قانون یہ ہے کہ بے صبری ہمیشہ آدمی کے نقصان میں مزید اضافہ کرے۔ اور صبر آدمی کو اس قابل بنائے کہ وہ ایک چانس کو کھونے کے بعد وہ دوسرے چانس کو نہ کھوئے، وہ دوسرے چانس کو استعمال کرتے ہوئے اپنے اس نقصان کی تلافی کرلے۔ اس دنیا کے بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ ایک موقع کو کھونا، کبھی خاتمہ کے ہم معنی نہیں ہوتا، بلکہ وہ نئے موقع کو دریافت کرکے اس کو استعمال کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔

پاکستانی ڈائسپورا
Pakistanis in Diaspora

پاکستان 1947 میں بنا۔ اس کے بانیوں کا خواب تھا— پاکستان کو ایک علاحدہ مسلم اسٹیٹ (separate Muslim state) بنانا۔ مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہاں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ پاکستانی مسلمان بڑی تعداد میں پاکستان کو چھوڑ کر باہر کے ملکوں میں جانے لگے۔ یہاں تک کہ پاکستانی مسلمانوں کی پاکستان سے باہر ایک بڑی کمیونٹی وجود میں آ گئی۔ اس کمیونٹی کو پاکستانیز ان ڈائسپورا (Pakistanis in Diaspora) کہا جاسکتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً 8 ملین ہے:

There are around eight million Pakistani people living abroad.

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں، یہ جو ہوا، یہ اللہ کے منصوبہ کے تحت ہوا۔ پاکستانی قوم ایک زندہ قوم ہے۔ اللہ کو یہ منظور ہوا کہ وہ پاکستانی قوم کو ایک زیادہ بڑے مشن کے لیے استعمال کرے۔ وہ تھا ساری دنیا میں پاکستانیوں کو پرامن خدائی سفیر (ambassadors of God) بنانا، پاکستانیوں کو یہ دعوتی رول دینا کہ وہ اللہ کے پیغام کو ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچائیں۔

یہ گویا باعتبارِ صورت صحابہ کی تاریخ کا ایک اعادہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ تیرہ سال بعد آپ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے۔ ہجرت سے پہلے آپ نے کہا تھا: أمرت بقرية تأكل القرى، يقولون يثرب، وهي المدينة۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1871) یعنی مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے، جو بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، اور وہ مدینہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول سادہ طور پر مدینہ کی فضیلت کا بیان نہ تھا۔ یہ دراصل ایک عالمی دعوتی عمل (process) کی پیشین گوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہجرت کے بعد مدینہ اسلام کا

دعوتی مرکز بنے گا۔ اس کے بعد یہاں سے ایک منصوبہ بند دعوتی عمل شروع ہوگا جو آخر کار پوری آباد دنیا کا احاطہ کرلے گا۔

اسلام کا دعوتی عمل مکہ میں شروع ہوا، پھر مدینہ اس کا مرکز بنا۔ اس کے بعد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اہل ایمان کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نبوت کے 23 ویں سال 632 عیسوی میں وہ حج ادا کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس حج میں صحابہ کی جو تعداد آپ کے ساتھ تھی وہ ایک لاکھ (100,000) سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

اس اجتماع کے موقعہ پر پیغمبر اسلام نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اللہ نے مجھ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، تم میرے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچا دو۔ پیغمبر اسلام کے اس ارشاد سے اصحاب رسول کو عمل کا ایک نشانہ (target) مل گیا۔ وہ عرب سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیل گیے۔

اس کی ایک مثال میں نے ایک سفر کے دوران قبرص (Cyprus) میں دیکھی، جو کہ ایسٹرن میڈیٹیرینن سی میں واقع ہے۔ یہاں سمندر کے ساحلی شہر لارناکہ (Larnaca) کے مقام پر ایک صحابیہ ام حرام بنت ملحان (وفات 27 یا 28ھ) کی قبر اب تک موجود ہے۔

حجۃ الوداع کے بعد جو صحابہ عرب سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل گیے، وہ گویا صحابہ اِن ڈائسپورا (Sahaba in Diaspora) تھے۔ انھوں نے ہر ملک میں پرامن دعوہ ورک کیا۔ اسی طرح جو پاکستانی مسلمان اس وقت ڈائسپورا میں ہیں، اگر وہ ہر ملک میں پرامن دعوہ ورک کریں تو ان شاء اللہ ان کو اللہ کی توفیق سے اس جیسا درجہ مل سکتا ہے جو اسلام کے دور اول میں صحابہ ان ڈائسپورا کے لیے مقدر ہوا تھا۔

موجودہ زمانہ پرنٹنگ پریس اور کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں دعوت کا کام بہت آسان ہو چکا ہے۔ اور وہ ہے پرامن انداز میں قرآن کا ترجمہ مختلف زبانوں ڈسٹری بیوٹ کرنا، اور اسی کے ساتھ سپورٹنگ لٹریچر کو لوگوں تک پہنچانا۔

دنیا کی حقیقت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: أَلا إِنَّ الدنیا ملعونةٌ ملعونٌ ما فیها، إلا ذکرُ اللهِ وما والاهُ، وعالمٌ، أو متعلمٌ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: 2322)۔ دنیا ملعون ہے، اس کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کی یاد کے اور وہ چیز جو اللہ سے قریب کرنے والی ہو، اور جاننے والا، اور سیکھنے والا۔

اس حدیث میں ملعون کا مطلب بے قیمت (valueless) ہونا ہے۔ یہ بات آخرت کے مقابلے میں کہی گئی ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق اصل اہمیت آخرت کی ہے۔ اس نسبت سے دنیا کی کامیابی بھی بے قیمت ہے، اور یہاں کی ناکامی بھی بے قیمت۔ دنیا کی کامیابی اور ناکامی میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

دنیا کے کسی واقعے یا کسی تجربے کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ اس کو آخرت کے اعتبار سے جانچا جائے۔ جانچنے کے اس معیار کو ایک لفظ میں معرفت کہا جاسکتا ہے۔ دنیا میں انسان کے ساتھ جو تجربہ گزرے، وہ خواہ مثبت تجربہ ہو یا منفی تجربہ، وہ اس وقت باقیمت ہے جب کہ وہ انسان کی معرفتِ خدا میں اضافہ کرنے والا ہو۔ جو تجربہ معرفت میں اضافہ نہ کرے، اس کی کوئی قیمت نہیں۔

دنیا کا ہر تجربہ اپنے اندر معرفت کا ایک پہلو رکھتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دنیا کے ہر تجربے میں معرفت کے اس پہلو کو دریافت کرے، وہ مسلسل طور پر اپنے علمِ الٰہی کو بڑھاتا رہے۔ دنیا کا ہر واقعہ باعتبارِ حقیقت اس لئے ہوتا ہے کہ وہ انسان کے اندر معرفت کے سفر کو مسلسل طور پر جاری رکھے۔ دنیا کی زندگی کو جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ آدمی نے مادی طور پر کیا کھویا اور کیا پایا، بلکہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں معرفت کا سفر جاری ہے یا نہیں۔ اگر آدمی ذہنی اعتبار سے اتنا بیدار ہو کہ دنیا کے نشیب و فراز کے باوجود معرفت کا سفر اس کے ذہن میں مثبت طور پر جاری ہے تو ایسا انسان ایک کامیاب انسان ہے۔ حدیث میں عالم کا لفظ معرفت کی دریافت کرنے والے کے معنی میں ہے، اور متعلم وہ ہے جو معرفت کی دریافت میں لگا ہوا ہو۔

اللہ کی انگلیوں کے درمیان

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن قلوب بني آدم كلها بين إصبعين من أصابع الرحمن، كقلب واحد، يصرّفه حيث يشاء (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2654) یعنی بنی آدم کے دل سب کے سب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، ایک دل کی طرح، اللہ انسان کے دل کو پھیر دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔

اس حدیث میں انسانی زندگی کی ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ اللہ جب کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو وہ انسانوں کے دل میں یا کسی ایک انسان کے دل میں وہ بات ڈال دیتا ہے، جو اس وقت مطلوب ہے۔ اس طرح انسان داخلی تحریک کے تحت حرکت میں آجاتا ہے۔ اور پھر وہ کام انجام پاجاتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو محسوس ہو کہ فلاں شخص یا فلاں لوگ اس کے راستے میں رکاوٹ ہیں، تو وہ انسان سے ٹکراؤ نہ کرے، کیوں کہ اصل مسئلہ اللہ کا ہے نہ کہ انسان کا۔ اس کو چاہیے کہ بظاہر انسان کا مسئلہ ہو تب بھی وہ اس کو اللہ سے مانگے، وہ اس کے لیے اللہ سے دعا کرے۔ اگر اللہ چاہے گا تو وہ متعلق انسان کے دل کو پھیر دے گا۔ اور وہ متحرک ہو کر ضروری کام انجام دے دے گا۔

اس حدیث سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ اگر معاملہ بظاہر انسان سے ہو تب بھی اس کو اللہ کا معاملہ سمجھنا چاہیے، اور اس کی تکمیل کے لیے اللہ سے مدد مانگنا چاہیے۔ اگر اللہ چاہے گا تو وہ دخل دے کر کام بنا دے گا، اور اگر اللہ کی مرضی نہ ہوگی تو کوئی بھی سرگرمی یا ہنگامہ آرائی کام بنانے والی نہیں۔ اللہ کا طریقہ خاموشی کے ساتھ مینج (manage) کرنے کا طریقہ ہے۔ اللہ کا یہ عمل بظاہر دکھائی نہیں دیتا، لیکن وہ ضرور اپنا عمل کرتا ہے۔ اگر انسان کی دعا اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق ہو تو اللہ اس کو ضرور پوری کرے گا۔ بشرطیکہ انسان اپنے غلط کارروائی کے ذریعے معاملے کو بگاڑ نہ دے۔ اس معاملے میں انسان کو صبر کو ثبوت دینا ہوگا۔ جو کہ قبولیت دعا کی لازمی شرط ہے۔

بلا استحقاق عطیہ

قرآن میں ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (45:13) یعنی اور اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمھارے لئے مسخر کر دیا، سب کو اپنی طرف سے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔

ایک انسان اگر کسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر اپنے چاروں طرف دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھے اور نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو سوچے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا، اس دنیا میں تو نے سب کچھ مجھے بلا استحقاق اور بلا طلب دے دیا۔ یہ سوچ اس کو آخرت کی یاد دلائے گی، اور پھر وہ کہہ اٹھے گا خدایا، آخرت میں بھی تو میرے ساتھ اسی طرح رحمت کا معاملہ فرما۔ تو مجھ کو بلا حساب جنت میں داخل کر دے۔

انسان کے اندر اگر ایمانی بیداری ہو، اور اس کے اندر اعلی درجے کا ایمانی شعور پیدا ہو جائے تو اس کو بار بار اس طرح کا تجربہ ہوگا۔ وہ اپنے اندر خالق کو دریافت کرے گا۔ وہ کائنات کی ہر چیز میں رب السموات والأرض کا مشاہدہ کرے گا۔ ہر تجربہ اس کے لیے ربانی تجربہ بن جائے گا۔ انہی ربانی تجربات کے درمیان وہ جنتی شخصیت بنتی ہے جس کو مزکّیٰ شخصیت (purified soul) کہا جاتا ہے۔ جنت کسی کو کسی خارجی چیز پر نہیں ملے گی، بلکہ خود اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کے ذریعہ ملے گی۔ ربانی شخصیت کی تعمیر کا یہ معاملہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ ایمانی شعور پیدا ہونے کے بعد وہ انسان کے اندر ساری عمر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ انسان اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب سے جا ملتا ہے۔

قرآن وسنت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں سب سے زیادہ اہمیت کی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انگلیوں پر یا تسبیح کے دانوں پر اللہ کے لفظ کا ورد کیا جاتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تصور آدمی کے ذہن میں اس طرح سما جائے کہ وہ انسان کے فکری عمل (thinking process) میں شامل ہو جائے۔

بڑا کام

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تواضع لله درجة رفعه الله درجة، حتى يجعله في عليين، ومن تكبر على الله درجة، وضعه الله درجة، حتى يجعله في أسفل السافلين (مسند احمد، حدیث نمبر 11724)۔ یعنی جس نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی ایک درجہ تو اللہ اس کو ایک درجہ بلند کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کو علیین میں پہنچا دیتا ہے۔ اور جس نے اللہ کے مقابلے میں کبر کی روش اختیار کی ایک درجہ تو اس کو اللہ ایک درجہ نیچے کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو اسفل سافلین میں ڈال دیتا ہے۔

یہ کوئی پراسرار بات نہیں بلکہ وہ اس دنیا کے لیے اللہ کا ایک مقرر کردہ فطرت کا قانون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص تواضع (modesty) کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہونے لگتے ہیں جو کہ بڑا کام کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کوئی بڑا کام انجام دے۔ لیکن بڑا کام انجام دینے کے لیے ہمیشہ اعلیٰ صفات درکار ہوتی ہیں۔ جس کو قرآن میں خُلُق عظیم (68:4) کہا گیا ہے۔ خُلُق عظیم سے مراد اعلیٰ اخلاق (sublime character) ہے۔ اعلیٰ اخلاق کے بغیر کوئی شخص کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔

فطرت کے قانون کے مطابق ایسے انسان کو ہر قسم کی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس کبر پسند انسان اللہ کا غیر مطلوب انسان ہے۔ ایسے انسان کو اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے۔ اور جس انسان کا ساتھی شیطان بن جائے اس کے لیے خدا کی دنیا میں ذلت اور ناکامی کے سوا کچھ اور مقدر نہیں۔ لوگ عام طور پر اپنی ذات میں جیتے ہیں، ایسے لوگ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ بڑا کام کرنے والا وہ شخص ہے جو اپنی ذات کے باہر جینے والا بن گیا ہو، جو دینے والا بن کر جیے، نہ کہ صرف لینے والا بن کر۔

عدم اعتراف

ایک صاحب نے کہا کہ میرے ملنے والوں میں ایک شخص ہے جو بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔ پھر اس کے کہنے پر میں نے اس کو بزنس شروع کرنے کے لیے کچھ رقم دے دی۔ اس کا بزنس کامیاب ہوگیا۔ لیکن اب وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔ رقم کی واپسی کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ تو عام بات ہے جس کے ساتھ بھی آپ کوئی اچھا سلوک کریں گے وہ بعد کو آپ کے لئے اجنبی جیسا بن جائے گا۔

عطیہ کے بارے میں انسان کا یہ عام مزاج ہے۔ عطیہ پانے سے پہلے وہ عطیہ کو دوسرے کی چیز سمجھتا ہے، مگر عطیہ پانے کے بعد وہ اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیتا ہے۔ انسان کے اس مزاج کی وجہ سے بے اعترافی کا کلچر ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔

انسان جب انسان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے تو وہ اس کا عادی بن جاتا ہے۔ پھر انسان کے ساتھ اس کی ناشکری خالق کے ساتھ ناشکری تک پہنچ جاتی ہے۔ خالق کی طرف سے انسان کو اتنی زیادہ چیزیں ملی ہوئی ہیں کہ ان کی گنتی نہیں۔ چونکہ یہ چیزیں انسان کو پیدا ہونے کے بعد اپنے آپ مل جاتی ہیں اس لئے اپنے عام مزاج کے مطابق انسان یہ کرتا ہے کہ ملی ہوئی چیز کو وہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان چیزوں کو خالق کا عطیہ نہیں سمجھتا بلکہ ان کو اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی چیز سمجھتا ہے۔

انسان کا یہی مزاج ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے عطیات کا اعتراف نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ خالق کے برتر عطیات کا بھی اعتراف نہیں کرتا۔ وہ انسان کے بارے میں بھی ناشکری کا معاملہ کرتا ہے اور خالق کے معاملہ میں بھی ناشکری کا معاملہ۔ یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ شکر (acknowledgment) سب سے بڑی نیکی ہے۔ یہ نیکی انسان کی نسبت سے بھی مطلوب ہے، اور خدا کی نسبت سے بھی۔ جو آدمی اس نیکی سے خالی ہو، وہ یقینا دوسری نیکیوں سے بھی خالی ہو جائے گا۔

بیانیہ اسلوب، تجزیاتی اسلوب

تحریر کے دو طریقے ہیں — بیانیہ اسلوب، اور تجزیاتی اسلوب۔ بیانیہ اسلوب یہ ہے کہ آدمی ایسی بات کہے جو اس کے اپنے ذہن کی بات ہو، لیکن اس کے ذہن کے باہر اس کا کوئی واقعاتی مصداق موجود نہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ مغرب میں استشراق نوآبادیاتی حکومتوں کو تقویت پہنچانے کے لیے پیدا ہوا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے ساتھ ضروری دلیل شامل نہیں۔

تجزیاتی اسلوب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ مستشرقین کا تصور ہر لحاظ سے مختلف تھا۔ اس کے لحاظ سے انھوں نے چیزوں کا مطالعہ کیا۔ مثلاً وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے۔ اپنے اس تصور کے مطابق انھوں نے مذہب کی باتوں کی توجیہہ بیان کی۔ یہ تصور مسلم علماء کے تصور کے خلاف تھا۔ مسلم علماء اس پر مشتعل ہو گیے۔ مگر مسلم علماء کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مستشرقین کے مذہبی تصور کا تجزیہ دلائل کی زبان میں کرتے۔ اس کے برعکس، وہ اس قسم کی الزامی باتیں کہنے لگے کہ استشراق اہل مغرب کی سازش ہے۔

مسلم اہل قلم نے استشراق کے خلاف بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔ مگر راقم الحروف کے علم کے مطابق یہ کتابیں ردعمل کی مثالیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی کتاب غالباً علمی تجزیہ کی مثال نہیں۔

جدید استشراق دراصل سائنٹفک نقطۂ نظر کے تحت پیدا ہوا۔ سائنسی طریقِ مطالعہ میں چیزوں کو معلوم ظواہر کے اعتبار سے آبجیکٹیو (objective) طور پر جانچا جاتا ہے۔ اس طریقِ مطالعہ میں یہ بات خارج از بحث ہے کہ چیزوں کو وحی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس طریقِ بحث نے علماء کو استشراق کے بارے میں منفی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ مگر منفی سوچ کے تحت استشراق کے خلاف بیانات دینا بے فائدہ ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے استشراق کا تجزیہ علمی حقائق کی بنیاد پر کیا جائے۔ اس زمانے میں تجزیاتی اسلوب کی قیمت ہے، بیانیہ اسلوب کی اس زمانے میں کوئی قیمت نہیں۔ بیانیہ اسلوب میں لکھی ہوئی چیزیں صرف ردی کی ٹوکری میں جگہ پاتی ہیں۔

بلاشرط ساتھ دینا

مشن کا تصور پہلے ایک انسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ انسان اس کو عملاً شروع کرتا ہے، لیکن کسی مشن کی کامیابی اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ بہت سے لوگ اس کا ساتھ دیں۔ ان ساتھ دینے والوں کو بلاشرط صاحب مشن کا ساتھ دینا چاہئے۔ اگر ان کا مزاج مشروط ساتھ دینے والا ہو تو وہ پوری طرح مشن میں اپنا حصہ ادا نہیں کرسکیں گے۔ کسی نہ کسی مقام پر وہ کوئی شکایت یا کوئی عذر (excuse) لے کر صاحب مشن کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

بلاشرط صاحب مشن کا ساتھ دینا کوئی شخصیت پرستی (personality cult) کا معاملہ نہیں۔ وہ شعوری ارتقا کا معاملہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دو انسانوں کی فکری سطح (wavelength) ایک ہو جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو انسان ذہنی اعتبار سے اس درجے میں پہنچ جاتا ہے کہ اس کی فکر الگ نہ ہو۔ اس قسم کے افراد جب کسی مشن کے گرد اکٹھا ہوں اسی وقت وہ مشن کامیاب ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (61:4) یعنی اللہ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستے میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ ایک کامل اتحاد کا معاملہ ہے۔ اس قسم کا اتحاد صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ صاحب مشن اور مشن کے ساتھیوں کی فکری سطح پوری طرح ایک ہو گئی ہو۔ اس کامل اتحاد کا تعلق میدان جنگ سے بھی ہے اور اس حالت سے بھی ہے جب کہ جنگ نہ ہو رہی ہو، بلکہ پرامن انداز میں اسلام کا کام کیا جا رہا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بڑا کام ایک شخص نہیں کرسکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے افراد کے درمیان کامل اتحاد ضروری ہے۔ یہ اتحاد خود ایک عظیم عبادت ہے۔ اس عبادت میں کوئی شخص صرف اس وقت پورا اتر سکتا ہے، جب کہ وہ شعوری پختگی کے درجے تک پہنچ چکا ہو۔ وہ ایک معاملہ اور دوسرے معاملے کے درمیان فرق کرنا جانتا ہو۔

دین اور اسٹیٹ

ایک مشہور جماعت کے بانی اپنی ایک کتاب میں دین کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں اسٹیٹ کے معنی ہیں، لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کرکے اس کی اطاعت کرنا، یہ اسٹیٹ ہے، یہی دین کا مفہوم بھی ہے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصۂ سوم)

اس اقتباس کا علمی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں دین کی تشریح بھی درست نہیں، اور اسٹیٹ کی تشریح بھی درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ادبی جملہ ہے، وہ دین اور اسٹیٹ کے بارے میں کوئی علمی بیان نہیں۔

لفظ دین کا مطلب اصلا وہی ہے جس کو مذہب (religion) کہا جاتا ہے۔ دین کا لفظ جب اسلام کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کے لیے خدا کی وہ ہدایت جو محفوظ حالت میں آج تک موجود ہے۔ دین کے لفظ میں اصولی اعتبار سے سیاست کا مفہوم شامل نہیں۔

اسٹیٹ کا مطلب ریاست ہے۔ اسٹیٹ ایک اجتماعی ہیئت ہے۔ علمی اعتبار سے اسٹیٹ کے چار اجزاء ہوتے ہیں — آبادی، رقبہ، اقتدار، حکومت:

population, territory, sovereignty, government

جدید تصور کے مطابق، ریاست ایک مستقل (permanent) چیز ہے، اور حکومت (government) ایک وقتی چیز۔ جمہوریت کے نظام میں حکومت کسی شخص یا خاندان کی اجارہ داری نہیں، وہ ہر چند سال کے بعد الیکشن کے ذریعے بدلتی رہتی ہے۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانے میں حکومت کا تعلق انتظامیہ (administration) سے ہوتا ہے۔ بقیہ شعبے اصولا آزاد شعبے ہیں۔ مثلاً تعلیم اور اقتصادیات، وغیرہ۔ انھیں آزاد شعبوں میں دعوت کا کام بھی شامل ہے۔

حکمت کا اصول

ایک حدیث رسول کا ترجمہ یہ ہے: عبداللہ ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ کہ عمر بن خطاب نے مدینہ کی مسجد کے دروازے پر دیکھا کہ ایک شخص ریشم کا کپڑا (حلة سیراء) بیچ رہا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اس کو خرید لیں، اور اس کو آپ جمعہ کے دن اور وفود کی آمد کے موقع پر پہنیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جو لوگ اس طرح کا کپڑا پہنیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس طرح کے کپڑے آئے، آپ نے اس میں سے ایک کپڑا عمر بن خطاب کو دے دیا۔ عمر نے کہا اے خدا کے رسول یہ آپ مجھ کو پہننے کے لیے دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اس سے پہلے آپ نے اس طرح کے کپڑے کے بارے میں کہا تھا جو کہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا میں نے یہ کپڑا اس لیے نہیں دیا ہے کہ تم خود اس کو پہنو۔ تو عمر بن خطاب نے یہ کپڑا اپنے بھائی کو پہننے کے لیے دے دیا، جو اس وقت مکہ میں شرک کے مذہب پر تھا، اس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا (أخاله بمكة مشركا)۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر 886

یہاں یہ سوال ہے کہ ریشم کا ایک کپڑا جو مومن کے لیے پہننا درست نہ تھا، وہ مشرک کو کیوں دے دیا گیا۔ اس کا سبب تالیفِ قلب تھا۔ یعنی مشرک کے دل کو نرم کرنا۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ بعد کو وہ مشرک اسلام میں داخل ہو گیا۔ تالیف قلب کا معاملہ حال کے اعتبار سے نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ مستقبل کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ تالیف قلب کے معاملے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ شخص آج کیسا ہے، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر اس سے تالیف قلب کا معاملہ کیا جائے تو کل وہ کیسا ہو سکتا ہے۔ تالیف قلب کا اصول مبنی بر مستقبل اصول ہے، نہ کہ مبنی بر حال اصول۔ مزید یہ کہ تالیف قلب کے مقصد کے لیے کسی کو کچھ سامان دیا جائے تو وہ اس کی اپنی پسند کے مطابق ہونا چاہیے، نہ کہ دینے والے کی پسند کے مطابق۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو تالیف قلب کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً ایک مومن کو خود اپنے لیے سادہ کپڑا پسند ہو سکتا ہے، لیکن جب کسی شخص کو تالیف کے لیے کپڑا دینا ہو تو اس کو اچھا کپڑا دیا جائے گا نہ کہ سادہ کپڑا۔

حروفِ مقطعات

حروف مقطعات قرآن کی 29 سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ کسی میں ایک حرف، کسی میں دو حروف، اور کسی میں زیادہ حروف۔ یہ حروفِ مقطعات پراسرار (mysterious) نہیں ہیں۔ بلکہ وہ نہایت بامعنی ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

حروفِ مقطعات کا مطلب الگ الگ حروف (disjointed letters) ہیں۔ یہ حروف وہی ہیں جو حروفِ تہجی (alphabets) کے لیٹر ہوتے ہیں۔ ہر زبان کے الفاظ حروفِ تہجی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ حروفِ مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کسی ملکوتی زبان یا ملاأعلی کی زبان میں نہیں ہے، بلکہ وہ انسانی زبان میں ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جائے گا، جو انسانی زبان کو سمجھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں آیا ہے: وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ (3:146)۔ یہاں قاتل لفظی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ شدید جدوجہد کے معنی میں ہے۔ یعنی پیغمبر کے ساتھیوں نے دعوت کی پرامن کوشش میں پوری طاقت صرف کردی۔

یہ اسلوب انسانی زبان میں عام ہے۔ مثلاً ریلیف ورک تیزی سے ہو رہا ہو تو اس کو کہا جاتا ہے کہ ریلیف کا کام جنگی پیمانے پر (on a war footing) انجام دیا جارہا ہے، وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں قرآن میں ہیں۔ قرآن کی اس قسم کی آیتوں کو اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو زبان کے عام اسلوب کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

حروفِ مقطعات کا مطلب اشارے کی زبان میں یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، لیکن وہ انسان کے لیے اترا ہے۔ اس لیے قرآن کا اسلوب وہی ہے جو انسانی کلام کا اسلوب ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (14:4) یعنی ہر پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بھیجا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیغمبر کے ذریعے آنے والا کلام لوگوں کے لیے ایک پراسرار کلام بن جاتا۔

شخصیت کی تعمیر

انسان کی شخصیت کی تعمیر کے بارے میں ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: کل الناس یغدو فبایع نفسه فمعتقها أو موبقها (صحیح مسلم، حدیث نمبر 223)۔ یعنی ہر انسان چل رہا ہے، پس وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہے، پھر کوئی اپنے آپ کو آزاد کرتا اور کوئی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ وہ حقیقت وہی ہے جس کو موجودہ زمانے میں کنڈیشننگ کا عمل (process of conditioning) کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے خارجی حالات سے اثر قبول کرنا۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ایک ماحول کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے صبح و شام اس ماحول کے اندر گزارتا ہے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ماحول کا اثر قبول کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ہر عورت اور ہر مرد کی شخصیت کی تعمیر ایک خارجی ماحول کے اندر ہوتی ہے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اس طرح بن کر تیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی پیداوار (product of his environment) بن جاتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے اپنے بارے میں دو قسم کے اختیار (options) ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کے حوالے کر دے۔ اس کے قریبی حالات اس کو جیسا بنائیں ویسا ہی وہ بنتا چلا جائے۔ اس کے قریبی حالات اگر اس کے اندر منفی شخصیت کی تعمیر کر رہے ہوں تو وہ اس سے متاثر ہوتا رہے، یہاں تک کہ وہ ایک منفی ذہن والا انسان بن جائے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے جو اپنے ذہن کو بیدار کرے، وہ اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرے، وہ ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ چیزوں کا آزادانہ تجزیہ کر سکے، وہ غیر متاثر انداز میں چیزوں کی قدر و قیمت متعین کرنا (evaluation) سیکھ لے۔ ایسا آدمی تاثر پذیری سے بچ جائے گا۔ وہ اپنے اندر ایک آزاد شخصیت بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

جنت اور جہنم

اسلام کی تعلیم کے مطابق، موجودہ دنیا ایک عارضی دنیا ہے۔ ہر انسان کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ موت کے بعد آخرت کی دنیا میں پہنچے، جہاں لوگوں کو ان کے عمل کے مطابق یا جنت میں جگہ ملے گی یا جہنم میں۔

اس تعلیم کے مطابق، جنت اور جہنم دونوں زندہ حقیقتیں ہیں۔ دونوں اسی طرح ایک زندہ واقعہ ہیں، جس طرح تاج محل ایک زندہ واقعہ ہے، یا لال قلعہ ایک زندہ واقعہ ہے۔ اسلام جب لوگوں کے اندر اپنی اسپرٹ کے ساتھ زندہ ہو تو اسلام کو ماننے والا ہر آدمی جنت اور جہنم کو حقیقی واقعہ سمجھتا ہے۔ اس کے اندر جنت کا زندہ اشتیاق موجود ہوتا ہے، اور جہنم کا زندہ خوف۔

مگر جب امت پر زوال کا دور آجائے، اس وقت امت کے افراد میں جنت اور جہنم کا زندہ تصور موجود نہیں رہتا۔ اس کے افراد رسمی عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم کو مانتے ہیں، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا کہ جنت ان کا سب سے بڑا کنسرن (concern) بنا ہوا ہو، اور جہنم کا خوف ان کے سینے میں ایک زلزلہ بن کر سمایا ہوا ہو۔ ان کا حال عملاً وہی ہو جاتا ہے جو حیوانات کا حال ہوتا ہے۔ حیوانات کے اندر نہ جنت کا شوق ہوتا ہے، اور نہ جہنم کا خوف۔ یہی حال زوال یافتہ لوگوں کا ہو جاتا ہے۔ وہ رسمی عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم کو مانتے ہیں، لیکن زندہ عقیدے کے طور پر جنت اور جہنم ان کے ذہن کا جزء نہیں ہوتا۔

قرآن میں ہے: وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ (3:133) یعنی اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔ اس کے برعکس، جہنم کا تذکرہ قرآن میں بار بار اس طرح ہولناک انداز میں کیا گیا ہے کہ اگر آدمی سوچے تو اس کا چین اور سکون ختم ہو جائے۔ لیکن دورِ زوال میں امت کے افراد کے اندر نہ جنت کا شدید اشتیاق موجود رہتا ہے، اور نہ جہنم کا شدید خوف۔ دورِ زوال کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

خبر کی تحقیق ضروری

قرآن کی سورہ نمبر 49 میں ایک اجتماعی اصول ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (الحجرات: 6) اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

قرآن کی اس آیت کا ایک شان نزول تفسیروں میں بیان ہوا ہے۔ اس کی روشنی میں غور کیا جائے تو آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض سنی ہوئی خبر پر کبھی رائے قائم کرنا نہیں چاہیے، بلکہ ہمیشہ اس کی تحقیق کرنا چاہیے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں سخت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی شدید غلطی کا شکار ہوجائے گا۔ حتی کہ ایسی غلطی بھی جس کی تلافی بعد کو ممکن نہ ہو۔

دوسروں کے بارے میں سنی ہوئی خبر اگر مثبت نوعیت کی ہو تو اس کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر کسی کے بارے میں سنی ہوئی خبر منفی نوعیت کی ہو تو ایسی خبر کو صرف سن کر کبھی نہیں ماننا چاہیے۔ منفی نوعیت کی خبر کو سن کر آدمی اگر کوئی منفی رائے بنالے تب بھی غلط ہے۔ اور اگر وہ اس قسم کی سنی ہوئی خبر کی بنا پر کوئی عملی کارروائی کرنے لگے تو اس کا ایسا کرنا سخت گناہ ہوگا۔

کسی واقعے کی صحیح رپورٹنگ کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ واقعے کی صحیح نوعیت کو سمجھ نہیں پاتے اور نادانی کے ساتھ غلط صورت میں اس کو دوسروں سے بیان کرنے لگتے ہیں۔

منفی خبر کو سن کر دوسروں کے درمیان اس کا چرچا کرنا، جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ ایسا آدمی اپنے آپ کو اس رسک (risk) میں مبتلا کرتا ہے کہ اس کو آخرت میں مقعد صدق (seat of truth) پر بیٹھنے کی جگہ نہ ملے، وہ مقعد کذب کے سوا کہیں اور اپنے لیے جگہ نہ پائے۔

سوانح عمری

سوانح عمری (biography) لکھنا ایک مشکل آرٹ ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں آدمی یا تو اپنی سوانح عمری خود لکھتا ہے جسے خودنوشت سوانح عمری (autobiography) کہا جاتا ہے۔ جیسے برٹش فلاسفر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) کی خودنوشت سوانح عمری جو کہ پہلی بار 1967 میں شائع ہوئی۔ یا پھر کسی کی سوانح عمری ایسا شخص لکھتا ہے جو خود اعلی درجہ کی علمی صلاحیت رکھتا ہو۔ مثلا برٹش رائٹر سیموئل جانسن (Samuel Johnson) کی سوانح عمری جس کو جیمس باسویل (James Boswell) نے لکھا جو مسلمہ طور پر اعلی درجہ کی علمی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ سوانح عمری پہلی بار 1791 میں چھپی۔

غیر ترقی یافتہ ملکوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ غیر ترقی یافتہ ملکوں میں اب تک چیزوں کا اسٹینڈرڈائزیشن (standardization) نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح یہاں سوانح عمری کا بھی کوئی اسٹینڈرڈ قائم نہیں ہوا۔ کوئی بھی شخص کسی کی سوانح عمری لکھ کر چھاپ دیتا ہے جس کا کوئی علمی درجہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کی غیر معیاری سوانح عمری لکھنا غیر ترقی یافتہ ملکوں میں عام ہے جس کا عملا کوئی فائدہ نہیں۔

غیر معیاری سوانح عمری لکھنا اس شخص پر ظلم ہے جس شخص کے نام پر یہ سوانح عمری لکھی اور چھاپی گئی ہے۔ ایسی ہر سوانح عمری صاحب سوانح کا ناقص تعارف ہے۔ اس طرح کا ناقص تعارف کرنا اتنا ہی غلط ہے، جتنا کہ کسی سے بے بنیاد بات منسوب کرنا۔ جو لوگ ایسی سوانح عمری لکھیں وہ یہ رسک (risk) لیتے ہیں کہ علم کی عدالت میں ان سے پوچھا جائے کہ جو کام تمھارے کرنے کا نہیں تھا وہ کام تم نے کیوں انجام دیا۔

لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو نماز کے مسائل معلوم نہیں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ نمازِ باجماعت کی امامت کرے۔ لیکن لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ جس شخص کو تصنیف کے مسائل معلوم نہیں اس کو کسی علمی موضوع پر ہرگز تصنیف نہیں کرنا چاہیے۔

خالق کی کاملیت

قرآن (الملک: 3) میں چیلنج کی زبان میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی تخلیق میں کوئی فطور (flaw) نہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی کوشش کرے، وہ کائنات میں کسی قسم کے فطور کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔ یہ دراصل تخلیق کے حوالے سے خالق کی صفت کا بیان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا خالق آخری حد تک ایک کامل ہستی ہے۔

خدا جب کامل ہے تو اس کا عطیہ کبھی غیر کامل نہیں ہوسکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا انسان کو عارضی زندگی دے لیکن ابدی زندگی سے اس کو محروم رکھے۔ وہ انسان کو خواہش (desire) دے، لیکن وہ اس کو فل فلمینٹ (fulfillment) سے محروم رکھے۔ وہ انسان کو غم دے لیکن وہ اس کو خوشی سے محروم رکھے۔ وہ انسان کو نقصان کا تجربہ کرائے لیکن وہ اس کو یافت کے تجربے سے محروم رکھے۔ وہ انسان کو معیار پسند (idealist) بنائے لیکن آئڈیل ورلڈ (ideal world) سے وہ اس کو محروم رکھے۔ وہ انسان کو مستقبل بیں بنائے لیکن وہ اس کو مستقبل سے محروم رکھے۔

تخلیق میں اس قسم کا فرق ہونا، خدا کی کاملیت کے خلاف ہے۔ اور یہ بلاشبہ ناممکن ہے کہ خدا کی کاملیت میں کوئی غیر کامل پہلو موجود ہو۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے لیے خدا کا عطیہ کبھی غیر کامل نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا ارحم الراحمین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے استحقاق (deservation) میں کوئی کمی ہو تو خدا اپنی رحمت سے اس کو پورا کردیتا ہے۔ وہ انسان کی عملی کوتاہی کی تلافی اپنی رحمت کے ذریعے کردیتا ہے۔

ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے: أنا عند ظن عبدي بي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7405) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کی کمی کو دیکھ کر مایوس نہ ہو، بلکہ وہ خدا کی رحمت سے امید رکھتے ہوئے دعا کرے کہ اے خدا تو میرے ساتھ میرے عمل کے مطابق فیصلہ نہ فرما، بلکہ تو میرے ساتھ اپنی رحمت کے مطابق فیصلہ فرما۔

سادگی کی اہمیت

سادگی (simplicity) کی اہمیت دین میں بہت زیادہ ہے۔ سادگی کا ضد تکلف ہے۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں فرشتے ہوں گے۔ فرشتوں کی موجودگی سے وہاں روحانیت کا ماحول پیدا ہوجائے گا۔ وہاں غیر ضروری باتیں نہیں ہوں گی۔ وہاں کسی قسم کی منفی سوچ (negative thinking) نہیں پائی جائے گی۔ وہاں لوگوں کے لیے اللہ کے معاملے میں خشیت کی اسپرٹ ہوگی، اور انسان کے معاملے میں خیر خواہی کی اسپرٹ۔

اس کے برعکس طریقہ تکلف کا طریقہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں: نهينا عن التكلف (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7293)۔ یعنی ہم کو تکلف سے منع کیا گیا ہے۔ تکلف کا مطلب غیر ضروری اہتمام ہے۔ سادگی یہ ہے کہ چیزوں میں بقدرِ ضرورت پر اکتفا کیا جائے۔ اس کے برعکس، تکلف یہ ہے کہ ضرورت کے ساتھ ان چیزوں کو بھی شامل کیا جائے جو انسان کی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہیں۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں بناوٹ نہ ہوگی، اور جہاں بناوٹ ہوگی وہاں سادگی نہیں ہو گی۔ سادگی اور تکلف دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

تکلف کا ماحول روحانیت کا قاتل ہے۔ جہاں تکلف ہوگا وہاں شیطان کو گھسنے کا موقع مل جائے گا۔ شیطان کے اثر سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بدل جائے گا۔ لوگ ان چیزوں کے بارے میں حساس (sensitive) ہوجائیں گے، جن کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ لوگوں کی بات چیت میں سنجیدگی نہیں پائی جائے گی۔ لوگوں کے اندر شکر اور اعتراف کا ماحول نہ ہوگا۔ لوگ اہم اور غیر اہم کے فرق کو سمجھنے سے قاصر ہوجائیں گے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے اندر خدا اور آخرت کا مزاج باقی نہ رہے گا۔ فارم کے اعتبار سے ان کے یہاں بظاہر سب کچھ ہوگا، لیکن اسپرٹ کے اعتبار سے جو چیزیں مطلوب ہیں، وہ ان کے یہاں مفقود ہوجائیں گی۔ سادگی انسان کو خدا سے قریب کرتی ہے، اور تکلف انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے۔

سوچنے کا طریقہ

آبسیشن (obsession) کا لفظ عام طور پر negative معنی میں لیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے فخر کے obsession میں جینے لگے، وغیرہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ obsession کی دو قسمیں ہیں— wrong obsession اور right obsession۔ جس طرح ایسا ہوتا ہے کہ غلط obsession آدمی کے اوپر چھا جاتا ہے اور وہ right thinking کے قابل نہیں رہتا، اِسی طرح right obsession بھی صحیح موقف کو متعین کرنے کے سلسلہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

right obsession کی ایک مثال یہ ہے کہ مسلمانوں کی پچھلی ہزار سال کی تاریخ میں ایک بات بہت بار دہرائی گئی کہ قرآن وسنت کا اتباع کرو، قرآن وسنت کا اتباع کرو۔ اس طرح قرآن وسنت کا اتباع مسلمانوں کے لیے ایک obsession بن گیا۔ بظاہر یہ ایک right obsession تھا۔ مگر ہزار سال کے دوران ٹریڈیشنل فریم ورک کی بنا پر وہ لوگوں کو right نظر آتا رہا۔ مگر 20 ویں صدی میں جب زمانہ بدلا اور سائنٹفک فریم ورک کا دور آ گیا تو مسلم ذہنوں کا یہ آبسیشن دور جدید میں عملاً غیر متعلق (irrelevant) ہو گیا۔ اس دور میں جو مسلم رہنما اٹھے وہ بدستور قرآن وسنت کی اتباع پر زور دیتے رہے، لیکن وہ یہ سمجھ نہ سکے کہ اب نئے فریم ورک کا زمانہ آ گیا ہے۔ اب قرآن وسنت کے ساتھ اجتہاد کا اضافہ کرنا ہوگا تب آدمی قدیم آبسیشن سے باہر آ کر صحیح انداز میں سوچنے کے قابل ہوگا۔

روایتی طرز فکر کے مطابق انسان صرف ایک ڈائی کاٹومی (dichotomy) میں سوچتا تھا۔ صحیح اور غلط، right or wrong۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ ڈائی کاٹومی بدل گئی ہے۔ اب ایک تیسری چیز وجود میں آئی، وہ تھی حالات کے اعتبار سے غیر متعلق (irrelevant) ہونا۔ قرآن وسنت کی ڈائی کاٹومی بذات خود صحیح تھی۔ مگر یہ آبسیشن موجودہ زمانہ میں غیر متعلق (irrelevant) بن گیا۔ کیوں کہ اب نئے حالات میں قرآن وسنت کا ٹریڈیشنل تصور ناکافی ہو گیا۔ اب ضروری تھا کہ قرآن وسنت میں اجتہاد کا اضافہ کر کے اسلام کو دوبارہ نئے حالات کے مطابق متعلق (relevant) بنایا جائے۔

امیج بلڈنگ

موجودہ زمانے میں بعض اسباب سے عالمی سطح پر اسلام کی امیج (تصویر) یہ بن گئی ہے کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے۔ یہ بلاشبہ غلط ہے۔ اس بنا پر اس وقت پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کی امیج کو درست کیا جائے۔ امیج کو درست کرنے کا یہ کام موثر طور پر لٹریچر کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ادارہ الرسالہ نے مختلف مضامین اور کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے چار کتابیں یہ ہیں:

1. Quranic Wisdom. (pp. 352)
2. Islam and World Peace. (pp. 200)
3. The Prophet of Peace. (pp. 226)
4. The Age of Peace. (pp. 192)

ان کتابوں میں سے پہلی کتاب، قرآنک وزڈم یہ بتاتی ہے کہ قرآن تمام تر ایک امن کی کتاب ہے۔ دوسری کتاب، اسلام اینڈ ورلڈ پیس یہ بتاتی ہے کہ اسلام کی تعلیمات تمام تر امن پر مبنی ہیں۔ تیسری کتاب، دی پرافٹ آف پیس یہ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک امن کے پیغمبر تھے۔ چوتھی کتاب، دی ایج آف پیس یہ بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ مکمل طور پر امن کا زمانہ ہے۔ اب جنگ کیے بغیر صرف پرامن طریقِ کار کے ذریعے ہر مقصد کامیابی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اب آپ کو یہ کرنا ہے کہ ان کتابوں کو ساری دنیا میں فلڈ (flood) کردیں۔ ان کتابوں کو اس طرح پھیلائیں کہ وہ تمام لوگوں تک پہنچ جائیں۔ ان کتابوں کو اس طرح پھیلانا اسلامی دعوت کے کام کے لیے ان شاء اللہ ایک فتح باب ثابت ہوگا۔

جو لوگ ان کتابوں کو عالمی سطح پر پھیلانا چاہیں، ان کو ان شاء اللہ ادارہ الرسالہ کی طرف سے ضروری مدد دی جائے گی۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ خط یا ٹیلیفون کے ذریعے ادارہ سے ربط قائم کریں۔ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، اس میں ہر شخص کو اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لینا چاہیے۔

سوال وجواب

الرسالہ مئی 2015 کے صفحہ 37 پر آپ نے تقدیر اور تدبیر کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں آپ نے لکھا ہے کہ انسان کی آزادی یا مجبوری کا معاملہ ففٹی ففٹی کا ہے۔ یعنی انسان اپنی ذات کے اعتبار سے آزاد ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری جو چیز ہے وہ فطرت کا قائم کردہ انفراسٹرکچر ہے، اس انفراسٹرکچر کے بغیر انسان اپنے ارادے کا آزادانہ استعمال نہیں کرسکتا۔

مطلب یہ ہے کہ انسان انفراسٹرکچر کی رعایت کے ساتھ اپنی آزادی کا استعمال بناروک ٹوک کرتا رہے گا اور کرسکتا ہے۔ اس میں اللہ کا کوئی active رول نہیں ہے، یعنی انسان کی دنیوی زندگی میں اللہ کی کوئی مداخلت نہیں۔

میرا سوال یہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہماری فلاں ضرورت پوری کردے، ہمیں تندرست کردے، ہمارے قرضے ادا کروادے، وغیرہ۔ آپ کے مطابق اس قسم کی دعا کا کوئی مطلب نہیں، کیوں کہ اللہ آپ کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ بس انفراسٹرکچر کی رعایت کے ساتھ جو چاہیں آپ کرسکتے ہیں۔ اللہ کا رول قیامت کے بعد شروع ہوگا۔ کیا آپ کے مضمون کا یہی مطلب ہے۔ (ایڈووکیٹ مرزا ابرار بیگ، بھوپال)

جواب

الرسالہ کے مضمون میں جو بات کہی گئی ہے وہ عموم کے اعتبار سے ہے۔ عموم کے اعتبار سے اس دنیا میں انسان کا معاملہ یہی ہے۔ لیکن دعا کا معاملہ ایک استثنائی معاملہ ہے۔ دعا اگر اللہ کے نزدیک قابل قبول ہو تو اللہ ایسا کرتا ہے کہ وہ مداخلت کرکے انسان کی دعا پوری کردے۔

یہ بات ایک حدیث رسول میں ان الفاظ میں آئی ہے: لاَ يَرُدُّ القَضَاءَ إِلاَّ الدُّعَاءُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2139) یعنی قضا کو لوٹانے والی کوئی چیز نہیں سوا دعا کے۔ اس حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دعا اگر اللہ کے نزدیک قابل قبول دعا ہو تو اللہ ایسا کرتا ہے کہ وہ حالات میں مداخلت کرکے اس کو دعا کرنے والے انسان کے لیے موافق بنادے۔

خبر نامہ اسلامی مرکز—238

1۔ 21 جون 2015 کو ڈاکٹر حافظ منیر الدین احمد مقیم حال لندن صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے دعوت اور قرآن کی اشاعت کے متعلق گفتگو کی۔ موصوف نے صدر اسلامی مرکز کی کتاب تعبیر کی غلطی کے متعلق اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا، اور کتاب کے مضمون سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ مغرب کے مسلم نوجوانوں کے درمیان الرسالہ مشن کو فروغ دینے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

2۔ 4 جولائی 2015 کو فادر انجل اسکول نئی دہلی کے طلبا اور طالبات کے ایک گروپ نے صدر اسلامی مرکز سے تصوف کے بارے میں انٹرایکشن کیا۔ ان تمام لوگوں کو صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک ایک سیٹ دیا گیا۔

2۔ برٹش نیوز پیپر فائنانشیل ٹائمس کی، بیورو چیف جیوتسنا سنگھ نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو صدر اسلامی مرکز کے دفتر C-29 میں ہوا۔ انٹرویو کے بعد ان کو صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ دیا گیا۔

3۔ 9 جولائی 2015 کو اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد مین برانچ، رائچور میں افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں سنٹر فار پیس اینڈ کمونل ہارمنی رائچور کی جانب سے پروفیسر ظہیر الدین نے شرکت کی اور بینک کے تمام عملے کے درمیان انگریزی اور ہندی قرآن کے علاوہ دیگر دعوتی لٹریچر تقسیم کیا گیا جس کو لوگوں نے بڑے شوق سے قبول کیا۔

4۔ 14 جولائی 2015 کو ڈاکٹر انتا کمار گری (مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز) نے انٹرفیتھ ڈائیلاگ کے موضوع پر صدر اسلامی مرکز سے گفتگو کی۔ آخر میں ان کو ترجمہ قرآن (انگلش) اور امن کے موضوع پر لٹریچر ہدیے میں پیش کئے گئے۔

5۔ 17 جولائی 2015 کو سی پی ایس انٹرنیشنل، دہلی کی چیر پرسن ڈاکٹر فریدہ خانم نے جین سنٹر میں 'نان وائلینس — اے اسلامک پرسپیکٹیو' کے موضوع پر ایک پرزنٹیشن دیا۔ اس پروگرام میں یو ایس اے، کناڈا اور زمبابوے کے ہائی اسکولس کے 20 اساتذہ نے شرکت کی۔ پرزنٹیشن کے بعد 15 منٹ کا سوال وجواب کا سیشن ہوا۔ اس کے بعد تمام لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا۔ لوگوں نے بہت خوشی سے اس کو قبول کیا۔ اس پروگرام کا انعقاد وجئے بلبھ اسمارک جین مندر نے کرنال روڈ علی پور (نئی دہلی) میں کیا تھا۔

6۔ 19 جولائی 2015 کو بہٹا (پٹنہ، بہار) میں ایک مقابلہ جاتی پروگرام ہوا۔ اس پروگرام میں سینٹر فار پیس اینڈ آبجکٹیو اسٹڈیز، بہار و جھارکھنڈ کے حافظ ابوالحکم دانیال کو مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے وہاں ایک تقریر کی جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ تقریر کے بعد تمام حاضرین کے درمیان قرآن اور دعوتی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ اس پروگرام سے لوگ اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ دوبارہ انھوں نے قریب کی ایک مسجد میں ایک پروگرام کا نظم کیا، اور اسلام کے امن کے پہلو پر تقریر سنی۔

7۔ سی پی ایس کی کولکاتا ٹیم نے للت میموریل ہوسٹل آف آر جی کار میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل کے ایم بی بی ایس

کے طلباء کے ساتھ ایک انٹرایکٹیو سیشن کا انعقاد کیا۔ یہ پروگرام عید ملن کے موقع پر آرگنائز کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں ایک سو سے زیادہ طلبا نے شرکت کی۔] تمام شرکاء کو ترجمہ قرآن اور اسپرٹ آف اسلام بطور اسپر یچول گفٹ دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان دوسرے دعوتی لٹریچر بھی تقسیم کیے گیے۔ اس موقع پر جاتیہ ساہتیہ پرکاشن ٹرسٹ کے فاؤنڈر سکریٹری مسٹر شکتی موئے داس (شاعر، صحافی اور شنکری اسکالر) بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس موقع پر لوگوں سے خطاب کیا۔

8۔ 31 جولائی 2015 کو سی پی ایس سہارن پور کے ممبر ڈاکٹر اسلم خان (پرنسپل نیشنل میڈیکل کالج)، ایڈوکیٹ انیس صدیقی، اور دانش خان نے مسٹر اکھلیش یادو (وزیر اعلی، اتر پردیش) سے ان کے آفس (لکھنؤ) میں ملاقات کی۔ دوران ملاقات وزیر اعلی موصوف نے صدر اسلامی مرکز کے مشن کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں، اور امن اور روحانیت کے تعلق سے سی پی ایس مشن کے کام کا بھرپور اعتراف کیا نیز اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ آخر میں ہندی ترجمہ قرآن، اسپرٹ آف اسلام، کریشن پلان آف گاڈ اور وہاٹ از اسلام وغیرہ شکریے کے ساتھ قبول کیں۔ اس کے علاوہ سکریٹریٹ میں موجود تمام لوگوں کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

9۔ ذیل میں ایک دعوتی تاثر نقل کیا جارہا ہے:

I am writing to you to inform you that I have received the copy of the Quran that you had sent for me. Thank you so much for this wonderful gift. It helps me to understand the true meaning of the word of God. I love Hazrat Mawlana Wahiduddin Khan. I have watched his videos on the internet. I know he is a man of God. I always pray to God to give him more knowledge and wisdom to convey the word of God to mankind. I want to be one of his followers. (Ruben J. Barcala, The Philippines)

سی پی ایس کی ممبئی ٹیم 20 تا 26 ستمبر کو کشمیر کا دورہ کرے گی۔ اس دورے کا مقصد کشمیر میں موجود بے شمار دعوتی مواقع کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا، الرسالہ قارئین اور سی پی ایس کے ممبران کو منظم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ سی پی ایس کی یہ ٹیم 13۔14 فروری 2016 کو پربھنی، مہاراشٹر کا بھی دورہ کرے گی۔

اس ٹیم میں شامل افراد کے رابطہ نمبر درج ذیل ہیں:

Mr. Mehboob Honnutagi: 9619163993, Mr. Sajid Anwar: 9967044976
Dr. Junaid Shaikh: 9967480701

- اگر آپ کے پاس وقت کم ہے ...
- اور آپ مختصر وقت میں کسی تعمیری پرچہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ حکمت و نصیحت سے بھرپور سبق آموز واقعات مسلسل آپ کے مطالعہ میں رہیں ...
- اگر آپ عصری اسلوب میں اسلام کو پڑھنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ الحاد و لادینیت کی رد میں سائنٹفک مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ ایک ایسے رسالہ کے متلاشی ہیں جس میں قیامت کی یاددہانی، حشر و نشر کی ہولناکیاں، جنت و جہنم کے مناظر، خدائے ذوالجلال کی تجلّیاں، سیرتِ رسول کی جھلکیاں، صحابۂ کرام کی بے مثال قربانیاں ہوں ...

تو آپ

ہر مقام پر دینی رسالوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

مولانا وحید الدین خاں صاحب کا دینی و فکری و علمی ماہ نامہ

الرسالہ (اردو، انگریزی)

کا مطالعہ کیجئے

الرسالہ (اردو) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 08588822674, 011-465241511

الرسالہ (انگریزی) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Spirit of Islam
Centre for Peace, Bangalore
Tel. 080-22118978, Mob. 09060511653
Email.: thecentreforpeace@gmail.com

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاءِ اسلام
اسبابِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی جہاد (جدید)
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اظہارِ دین
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیہ
امنِ عالم
امہات المومنین (ڈاکٹر فریدہ خانم)
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن

تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویرِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیرِ انسانیت
تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حکمتِ اسلام
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خاندانی زندگی (پمفلٹ)
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دینِ وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983

ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (پمفلٹ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتمِ رسول کا مسئلہ
شہادت: امتِ مسلمہ کا مشن (جدید)
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علماء اور دورِ جدید
عورت معمارِ انسانیت

فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کتابِ معرفت
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائلِ اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (پمفلٹ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی شخصیت اور تحریک (ڈاکٹر فریدہ خانم)
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
نئے عہد کے دروازے پر
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17

Islam and World Peace

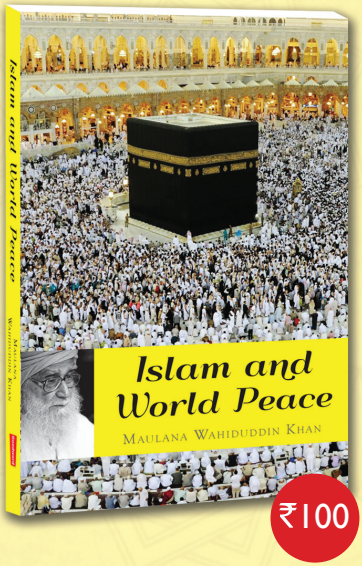

Lucidly written and expansive in scope, this work clears up the misunderstandings that abound on the subject of Islamic teachings about peace and war. It clearly states the authentic position on these matters, which is that Islam is a completely peaceful religion. In Islam, peace is the general rule or norm, and war is only an exception. Of the various names or attributes of God mentioned in the Quran, one is *As-Salam*, or 'The Source of Peace'. That is to say, God is Peace. Islam's mission centres on tawhid, the oneness of God. The Quran and the Prophet's life clearly aim to transform people's minds and hearts that they love just the one God, fear Him alone and make Him their greatest concern. This is the beginning of the Islamic mission as well as its finale. Ideal for students, scholars and the average reader, this brief and readable book provides keen insight into topics such as, the culture of peace, the 'Islamisation' of violence, terrorism, Islamic jihad, hijacking and hostage-taking, to name but a few.

Pages: 200